موجودہ تہذیب وتمدّن
اور عالم اسلام

از

مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی
(معتمد تعلیم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

ترتیب وپیشکش

محمد وثیق ندوی

ناشر

دار الرشید

۱۰۶/۱۶۴ خاتون منزل، حیدر مرزا روڈ، گولہ گنج لکھنؤ (یوپی)

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

۱۴۳۸ھ ۲۰۱۷ء

نام کتاب : .... موجودہ تہذیب وتمدن اور عالم اسلام
مؤلف : .... مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی
(معتمد تعلیم ندوۃ العلماء لکھنؤ)
ترتیب وپیشکش .... محمد وثیق ندوی
صفحات : ۲۲۴
تعداد : .... گیارہ سو
قیمت : Rs.180

ملنے کے پتے

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ، فون:0522-2741539
مکتبہ اسلام، گوئن روڈ، امین آباد، لکھنؤ، فون:9415912042
مکتبہ ندویہ، احاطہ ندوۃ العلماء، لکھنؤ، فون:9335070285
مکتبہ احسان، مکارم نگر، لکھنؤ، فون :9793118234
مکتبۃ الشباب العلمیۃ، شباب مارکیٹ، مکارم نگر، لکھنؤ 9696437283
الفرقان بکڈپو، نظیر آباد، لکھنؤ:6535664. (0522)2610443

ناشر

دار الرشید
Dar Al Rasheed

164/106 Khatoon Manzil, Haidar Mirza Road
Golaganj, Lucknow. Mo: 9452294097-9838154415

فہرست

پیش گفتار	۵
پیش لفظ	۱۲
مقدمہ	۱۶
حرفے چند	۱۸
موجودہ تہذیب اور انسان	۲۳
تہذیب حاضر میں انسانی احساس وشعور کا فقدان	۲۹
نام نہاد تہذیب میں انسان کی بے بسی	۳۴
متمدن انسان غیر متمدن انسانیت	۳۹
مغربی طرز حیات انسانی اقدار کے لیے ایک عظیم خطرہ	۴۳
مذہب اور اخلاق کے بغیر؟	۴۶
دور تحقیق میں حقائق کی پامالی	۵۱
خیر وشر کی تمیز کا فقدان	۵۷
یہ تو ہونا ہی تھا	۶۳
تعمیر کے پردہ میں تخریب کے سامان	۶۸
ٹریجڈی اور کامیڈی	۷۲
جرم کی بالادستی	۷۷

مغرب اور دہشت گردی	۸۷
مغربی سامراج	۹۵
یورپ کے اپنے مسائل	۱۰۱
یورپ کے اتحاد اور بقا کے لیے دشمن کا تصور ضروری ہے	۱۰۸
مغرب کا دوہرا معیار	۱۱۴
اسلام سے جنگ کا محرک مرعوبیت	۱۱۹
موجودہ عہد کے فساد کی بنیاد	۱۲۷
خیر و شر کے درمیان فرق کرنے کی صلاحیت صالح معاشرہ کی تشکیل کی بنیاد	۱۳۲
عہد نو کی آمد	۱۳۸
نئے نظام کے قیام کا نیا سامراجی منصوبہ	۱۴۶
امنِ عالم اور عالمی طاقتوں کی کشمکش	۱۵۱
مغربی سامراج کی واپسی	۱۵۶
عالم اسلام کی موجودہ صورت حال اور مغرب کا متضاد موقف	۱۶۱
ایک خطرناک رجحان	۱۶۸
عالم اسلام اور خطرات	۱۷۳
عالم اسلام کی ابتری کا سبب	۱۷۷
نئی صورت حال کے مقابلہ کے لیے	۱۸۳
شک و شبہ سے اعتماد کی طرف	۱۹۱
ٹکراؤ سے دعوت کی طرف	۱۹۸
اسلام پر فخر اور اس سے وابستگی	۲۰۸
اسلام فلسفہ نہیں نظام حیات ہے	۲۱۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش گفتار

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على سيد المرسلين محمد بن عبد الله الأمين، وعلى آله وصحبه أجمعين

کرنٹ موضوعات پر مشتمل فکر انگیز مقالات کا یہ مجموعہ پروفیسر احمد سجاد صاحب صدر شعبہ اردو رانچی یونیورسٹی کے گرانقدر مقدمہ کے ساتھ آپ کی خدمت میں پیش ہے، عنوان ہے ''موجودہ تہذیب وتمدن اور عالم اسلام'' لفظ ''تہذیب'' کی رعایت میں ''تہذیب'' کے دائرہ میں رہتے ہوئے آج کی اس تہذیب کو ''موجودہ'' کہیے، ''جدید'' کہیے، ''مغربی'' کہیے، کچھ کہیے، لیکن سچ تو یہ ہے کہ یہ تہذیب ہے شیطانی، آپ کہہ سکتے ہیں کہ شیطان کا تہذیب سے کیا لینا دینا؟ بات آپ کی درست، تو آیئے عنوان میں تھوڑی سی تبدیلی کیجیے اور کہیے ''شیطانی بدتہذیبی اور عالم اسلام''۔

ذرا سوچیے! جس تہذیب کی بنیاد خدا فراموشی پر نہیں، خدا سے بغاوت پر ہو، اخلاق کی پامالی پر ہو، بے حیائی کے فروغ پر ہو، عریانیت وفحاشی کی ترغیب پر ہو، انسان کے استحصال اور انسانی قدروں کی تکفین وتدفین پر ہو، کیا اس کو تہذیب کہا جاسکتا ہے؟۔

جس تہذیب نے عورت کو دربدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کیا، شمع محفل بنا کر اس کو مردوں کی تفریح کا سامان کیا، ماں باپ کو اولڈ ایج ہوم (Old age home) پہنچا کر اولاد کو ان کی خدمت سے محروم کیا، مادیت کی ہوا نہیں آندھی چلا کر روحانیت سے دلوں کو خالی کیا، کیا وہ تہذیب کہے جانے کے لائق ہے؟۔

تعلیم کو کاروبار کس نے بنایا؟ علاج ومعالجہ کو بزنس کی شکل کس نے دی؟ سود پر سود

چڑھا کر مقروض کو خودکشی پر مجبور کس نے کیا؟ ماں کی حیثیت کس نے گرائی؟ باپ کی زبان بندی کس نے کرائی؟ گھروں کی رونق کس نے چھینی،؟ خاندانی نظام کا شیرازہ کس نے بکھیرا؟۔

طلاق کے واقعات آج اتنی کثرت سے کیوں پیش آرہے ہیں؟ شادیوں کی ناکامی کے اسباب روز بروز کیوں بڑھتے جارہے ہیں؟ اختلاط مرد وزن کی تباہ کاری کا رونا آج ہر سو کیوں رویا جارہا ہے؟

کیا یہ سچ نہیں کہ یورپ سائنس وٹکنالوجی میں اپنی تمام تر ترقیوں اور نگاہوں کو خیرہ کردینے والی اپنے یہاں کی روشنیوں کے باوجود اندھیرے میں اترتا چلا جارہا ہے، باہر تو اجالا ہے، لیکن اندر اندھیرا ہی اندھیرا ہے، لوگ بستر پر ہیں، لیکن نیند نہیں، گھر میں ہیں لیکن سکون نہیں، بیوی ہے لیکن الفت نہیں، بچے ہیں لیکن انسیت نہیں، ماں باپ ہیں لیکن کوئی لگاؤ نہیں، بیٹا کہیں ہے تو بیٹی کہیں، شوہر کہیں ہے تو بیوی کہیں، نہ ٹوک سکتے ہیں، نہ روک سکتے ہیں، نہ پوچھ سکتے ہیں، کیوں کہ تہذیب کے نام پر بدتہذیبی کے اس ماحول میں سب آزاد ہیں۔

جس پہلو سے بھی آپ آج کی اس تہذیب کو دیکھیں اور جتنا اس کی گہرائی میں اتریں، دو ہی عنصر آپ کو ہر جگہ نظر آئیں گے: ایک مال کی ہوس جس کا نتیجہ سود ہے، دوسرا بے حیائی کو فروغ جس کا نتیجہ اخلاقی انارکی ہے اور یہ دونوں ہی کام شیطانی ہیں ﴿الشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُم بِالْفَحْشَاءِ﴾ (سورہ بقرہ:۲۶۸) [شیطان تمہیں فقر سے ڈراتا ہے اور بے حیائی پر آمادہ کرتا ہے]۔

آپ تائید کریں یا نہ کریں، سماج بگڑتا ہے بے حیائی سے، معیشت تباہ ہوتی ہے سود سے، سماج کے بگڑنے اور معیشت کے تباہ ہونے کا اندازہ شاید پورے طور پر ابھی نہ ہوسکے، لیکن آنے والے دنوں میں بے حیائی کی لعنت اور سود کی نحوست ہر آنکھ دیکھے گی، مغرب کی آنکھ چونکہ مشرق سے زیادہ تیز ہے، لہذا اب وہ کچھ کچھ دیکھنے لگی ہے، لیکن ہم شاید اس وقت دیکھ پائیں جب ہم بہت کچھ کھو چکے ہوں گے۔

جب بھی کوئی بری چیز اچھی نظر آنے لگے، بدنما خوشنما معلوم ہونے لگے، زیاں نفع

نظر آنے لگے، موت زندگی سمجھی جانے لگے، پستی بلندی تصور کی جانے لگے تو سمجھ لیجیے کہ اس میں شیطان کا ہاتھ ہے، انسان کا یہ دشمن ازلی نظر بندی میں ماہر ہے، ہوتا کچھ ہے، دکھاتا کچھ ہے، بھینس کے گوبر اور گھوڑے کی لید کو سونا چاندی یہ دکھائے اور سونے اور چاندی کے ڈھیر کو گوبر اور لید یہ بتائے، کٹی ہوئی گردن کو جڑی ہوئی اور جڑی ہوئی گردن کو کٹی ہوئی دکھانا تو اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے، قرآن کریم نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے ﴿وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيلِ وَكَانُوا مُسْتَبْصِرِينَ﴾ [سورہ عنکبوت: ۳۸] (اور شیطان نے ان کے کاموں کو ان کی نظر میں خوشنما بنا کر ان کو صحیح راستہ سے روک دیا حالانکہ وہ دیکھتے بھالتے لوگ تھے)۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ابلیس اپنا تخت پانی پر رکھتا ہے، اور لوگوں کو فتنہ اور گمراہی میں مبتلا کرنے کے لیے وہاں سے اپنا لشکر روانہ کرتا ہے، لشکر میں سب سے زیادہ اس کے قریب وہ ہوتا ہے جو فتنہ میں سب سے زیادہ بڑھا ہوا ہوتا ہے (مہم پر روانہ کردہ اس کے ہرکاروں میں سے) ایک واپس آکر کہتا ہے: میں نے یہ فتنہ پیدا کیا، وہ فتنہ پیدا کیا، ابلیس اس کے جواب میں کہتا ہے کہ تو نے کچھ بھی نہیں کیا، آگے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: پھر ان میں سے ایک آتا ہے اور کہتا ہے: میں نے اس وقت تک اس بندہ کا پیچھا نہیں چھوڑا جب تک کہ میں نے اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان جدائی نہیں ڈلوادی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ابلیس یہ سن کر اس کو گلہ لگالیتا ہے اور کہتا ہے: کام تو تو نے ہی کیا''۔

اس حدیث کو سامنے رکھ کر ذرا اپنے گردوپیش کا جائزہ لیجیے، آپ دیکھیں گے کہ مغربی تہذیب کے اثرات جہاں جہاں پڑ رہے ہیں وہاں وہاں شوہر اور بیوی کے درمیان ناچاقی بڑھ رہی ہے، کہنے کو تو وہ دونوں میاں بیوی ضرور ہیں، لیکن ایک خوشگوار ازدواجی زندگی سے وہ ہر طرح سے محروم ہیں، نہ وہ الفت ومحبت ہے نہ وہ خوشی وفرحت، نہ وہ سکون وقرار ہے نہ وہ اعتماد وبھروسہ، نہ حقوق کا کوئی خیال ہے نہ ذمہ داری کا کوئی احساس، دونوں

ہی کی اپنی ایک الگ دنیا ہے، اور دنوں ہی اپنی اس دنیا میں مگن۔

لاکھوں نہیں، کروروں خرچ کر کے شادیاں کی جاتی ہیں، خوب دیکھ بھال کر اور خوب ٹھوک بجا کر کی جاتی ہیں، شوہر اور بیوی میں ہر طرح سے یکسانیت ہوتی ہے، دولت میں یکسانیت، تعلیم میں یکسانیت، شکل وصورت میں یکسانیت، معیار زندگی میں یکسانیت، ذات وبرادری میں یکسانیت، تہذیب وثقافت میں یکسانیت، مزاج وطبیعت میں یکسانیت، پسند وناپسند میں یکسانیت، لیکن چند ہی دن گزرتے ہیں، کہ ان تمام یکسانیتوں کے باوجود دونوں میں دوری پیدا ہونے لگتی ہے، دوری بیزاری میں بدلتی ہے، اور بیزاری علاحدگی پر جا کر ختم ہوتی ہے۔

بے جوڑ شادی کا یہ انجام تو سمجھ میں آتا ہے، لیکن اتنی جوڑ دار جوڑی کا یہ انجام؟ ..... سمجھ سے بالاتر ہے، سوائے اس کے کہ یہ کہا جائے کہ یہ نتیجہ ہے اس شیطانی تہذیب کا ہے، جس نے مطلق آزادی کا نعرہ دیا، بے حجابانہ ملاقتوں کا سلسلہ شروع کیا، محبت آمیز لہجہ میں مرد سے بات کرنے کو عورت کے ایٹی کیٹ میں شمار کیا، صنف نازک کی مدح سرائی کو مرد کے لیے تہذیب وشائستگی کا معیار قرار دیا اور اس طرح دل کے روگیوں کو سماج میں روگ پھیلانے کا موقع دیا۔ عصمت دری اور آبروریزی کے واقعات اسی روگ کا نتیجہ ہیں، قانون بنتا رہے گا، سزائیں ملتی رہیں گی، لیکن جب تک اس شیطانی تہذیب پر لگام نہیں کسی جائے گی، واقعات کا سلسلہ بدستور جاری ہے گا۔

آج کی تہذیب نے اندروں خانہ کو بیرون خانہ کیا، کیا کھویا، کیا پایا؟ کسی عالم دین کی نہیں، سابق روسی صدر میخائیل گورباچوپ کی زبانی سنیے:

''ہماری مغربی تہذیب میں عورت کو گھر سے باہر نکال دیا گیا، اس کو گھر سے باہر نکال کر یقیناً ہم نے کچھ معاشی فوائد حاصل کر لیے، پیداوار میں کچھ اضافہ ہو گیا، کام کی رفتار بھی کچھ بڑھ گئی، مرد کا بوجھ بھی کچھ کم ہو گیا، اب مرد بھی کام کر رہے ہیں اور عورت بھی، لیکن اس کا ایک نقصان یہ ہوا کہ ہمارا فیملی سسٹم تباہ ہو کر رہ گیا، اس فیملی سسٹم کے تباہ ہونے پر ہم

نے جونقصانات اٹھائے وہ ان فوائد کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہیں، جو پروڈکشن کے اضافہ کے نتیجہ میں ہمیں حاصل ہوئے لہٰذا میں اپنے ملک میں ''پرواسٹرائیکا'' کے نام سے ایک تحریک شروع کررہا ہوں جس کا مقصد یہ ہے کہ وہ عورت جو گھر سے باہر نکل چکی ہے اس کو واپس گھر میں لایا جائے، کیونکہ اگر ہم عورت کو گھر میں واپس نہ لا پائے تو ہمارا فیملی سسٹم تو تباہ ہو ہی گیا ہماری قوم بھی تباہ ہو کر رہ جائے گی''۔

آج سے ۳۸ رسال پہلے ۱۹۷۷ء میں مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ امریکہ گئے تھے، دو مہینے وہاں قیام رہا، کیا دیکھا؟ کیا محسوس کیا؟ کیا نتیجہ نکالا؟ ملاحظہ ہو۔

''مغربی تہذیب تیزی سے زوال کی طرف جارہی ہے، وجہ یہ ہے کہ یہاں خاندانی نظام میں ابتری پیدا ہوگئی ہے، خاندانی نظام ٹوٹ رہا ہے شوہر اور بیوی میں جو اعتماد اور محبت ہونی چاہئے روز بروز اس میں کمی آرہی ہے، یہاں کے مفکر اور فلاسفر اس صورت حال سے پریشان ہیں، کتابیں لکھی جارہی ہیں، سروے پہ سروے ہورہے ہیں اور اس پر غور کیا جارہا ہے کہ مغرب کے معاشرتی نظام کو ٹوٹنے اور بکھرنے سے کیسے بچایا جائے، یہاں سب کچھ ہے، وسائل کا قدموں پر ڈھیر لگ گیا ہے، کائنات کی بہت سی طاقتوں کو انہوں نے مسخر کرلیا ہے، لیکن اپنے دل کی دنیا کو انہوں نے اجاڑ دیا ہے، اور اپنے گھر کی جنت کو انہوں نے جہنم بنادیا ہے''۔

یورپ کا المیہ یہ ہے کہ اس نے علوم وفنون میں تو بہت ترقی کی، نظم وضبط میں یقیناً اس نے ایک مثال قائم کی، عوام وحکومت کے درمیان تال میل کا ایک نمونہ اس نے پیش کیا، لیکن مذہبی قید وبند سے آزادی کے نتیجہ میں وہ تہذیب وثقافت میں بالکل پچھڑ گیا، عام انسان کی سطح تو چھوڑیے، ایک جانور کی سطح سے بھی نیچے گر گیا، قرآن کریم نے ایسے ہی لوگوں کے لیے کہا ہے۔ ﴿ أُولَـٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولَـٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ ﴾ [سورہ اعراف: ۱۷۹] (یہی وہ لوگ ہیں چوپایوں کی طرح ہیں؛ بلکہ ان سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے اور گمراہ، اور یہی وہ لوگ ہیں جو غفلت کے ساتھ جی رہے ہیں)۔

یورپ کے پاس ہر بیماری کا علاج ہے، لیکن بدتہذیبی کے اس روگ کا اس کے

پاس کوئی علاج نہیں، آگ لگتی ہے، پانی سے اس کو بجھایا جاسکتا ہے، لیکن یورپ نے بدتہذیبی کی جو آگ اپنے یہاں لگائی ہے وہ پانی سے نہیں، صرف اسلامی تہذیب سے ہی بجھائی جاسکتی ہے، لیکن یورپ اپنی انا، اپنے غرور اور بیجا احساس برتری کی وجہ سے شاید اپنے یہاں لگی اس آگ کو نہ بجھا سکے، لیکن وہ یہ ضرور چاہے گا کہ یہ آگ مشرق تک پہنچے تاکہ مشرق بھی اس آگ میں جلے۔

عالم اسلام کی کمی یہ رہی ہے کہ اس نے ایک حد تک مذہب سے وابستہ رہتے ہوئے اپنی تہذیب کو کچھ نہ کچھ تو برقرار رکھا، لیکن علوم وفنون میں وہ زیادہ ترقی نہ کرسکا، بلکہ شاید ترقی کرنے کا خیال بھی اسے نہ آیا، اس کو خدا نے بہت کچھ دیا تھا، اس کا جائے وقوع، اس کی اسٹراٹیجک اہمیت، اس کے معدنی ذخائر، اس کی افرادی قوت، اس کی تہذیب وثقافت، اس کا اسلامی کردار، اس کی روایات واقدار، لیکن افسوس کہ ان میں سے کسی ایک کا بھی وہ صحیح استعمال نہ کرسکا، کیونکہ یورپ نے اس کو اس طرح مفلوج کررکھا تھا کہ وہ یورپ کی بیساکھی کے بغیر ایک قدم بھی نہیں چل سکتا تھا، بیساکھی سے پیچھا چھڑانے کے لیے اسکو گرنے کا خطرہ مول لینا تھا، جس دن عالم اسلام یہ خطرہ مول لے لے گا تو صرف وہ نہیں چلے گا، اس کی تہذیب بھی چلے گی، اس کی ثقافت بھی چلے گی، اس کی زبان بھی چلے گی، اس کا لباس بھی چلے گا اور اس کا طور طریق بھی۔

ضرورت ہے کہ عالم اسلام اپنی مذہبی تعلیمات اور اپنی تہذیب وثقافت کو سینہ سے لگائے ہوئے یورپ کے اختیار کردہ ترقی کے راستہ پر چلے اور تہذیب وتمدن میں نہیں، تعلیم میں، ڈسپلن میں، جستجو میں، لگن میں، وقت کی قدر میں، کام سے دلچسپی میں، ترقی کی کوشش میں، پلاننگ اور منصوبہ بندی میں، دریافت کے شوق میں، خطرات سے ہمکنار ہونے میں، دنیا کو زیر کرنے کے جذبہ میں، آج کے یورپ کو پیش نظر رکھے نہ کہ سولہویں صدی کے اس بیمار یورپ کو جو علم سے دور، توہم پرست، باہم برسرپیکار اور خودساختہ مذہبی نظریات کا پابند تھا۔

آج کی رائج یہ تہذیب عالم اسلام کے لیے ایک چیلنج ہے، اس چیلنج سے کیسے نمٹا

جائے؟ بدتہذیبی کی اس بادسموم سے اپنی کھلتی کلیوں اور مہکتے پھولوں کو کیسے بچایا جائے؟ یہ کتاب اس سلسلہ میں ہماری پوری رہنمائی کرتی ہے۔ مسائل کو سمجھنا، چیلنجوں سے واقف ہونا، ان کی تہ تک پہنچنا، ان کے مثبت اور منفی پہلوؤں پر نظر رکھنا، قوموں پر پڑتے ان کے اثرات کو محسوس کرنا اور ان کی بنیاد پر رونما ہونے والی سیاسی، اقتصادی، ثقافتی، تعلیمی، اخلاقی، عقائدی، نظریاتی، معاملاتی تبدیلیوں کا ادراک کرنا اور اس کے تدارک کے لیے معاشرہ کے مزاج کو سامنے رکھتے اور نتائج کی سنگینی کو محسوس کرتے ہوئے لائحہ عمل پیش کرنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں، اس کے لیے ضرورت پڑتی ہے قلب سلیم کی، نظر ثاقب کی، دل دردمند کی، فکر ارجمند کی، تاریخ کے گہرے مطالعہ کی، تہذیبوں کے مزاج سے آشنائی کی، قوموں کے عروج وزوال کے اسباب سے واقفیت کی، اور بصارت کے ساتھ بصیرت کی، اور یہ چیزیں ہمیں ملتی ہیں معتمد تعلیم ندوۃ العلماء مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی کی تحریروں میں، یقین ہے کہ ان کے قلم سے نکلے یہ مضامین نہ صرف یہ کہ موجودہ تہذیب سے ہمیں واقف کرائیں گے؛ بلکہ اس کے خطرات سے ہمیں آگاہ بھی کریں گے اور اس کے مقابلے کے لیے ہمیں تیار بھی۔

ہم شکر گزار ہیں مولانا محمد وثیق ندوی (استاد تفسیر وعربی زبان وادب دار العلوم ندوۃ العلماء) کے کہ انہوں نے عربی میں لکھے گیے ان مضامین کو جمع کیا، اکثر کا ترجمہ کیا، محنت کی، وقت صرف کیا، ترتیب قائم کی اور یہ مفید مجموعہ تیار کر کے ہمارے اور آپ کے ہاتھ میں پہنچایا، اللہ ان کی اس کوشش کو قبول فرمائے اور ان کو اس کا بہتر صلہ عطا فرمائے۔

جعفر مسعود حسنی ندوی

۴/محرم/۱۴۳۷ھ

۱۷/۱۰/۲۰۱۵ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على سيد المرسلين وخاتم النبيين محمد بن عبد الله الأمين، وعلى آله وصحبه أجمعين وبعد۔

موجودہ دور کے حالات، خاص طور سے عالم اسلام کو جو مسائل درپیش ہیں، ان کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم یورپ یا مغرب کی تاریخ، قومی مزاج اور اس کے اور عالم اسلام کے درمیان اس طویل تاریخ میں جو روابط رہے ہیں، ان سے واقفیت حاصل کریں، سوائے تاتاری فتنہ کے مسلمانوں کا اصل ٹکراو مسیحی دنیا سے رہا ہے۔

صلیبی جنگوں میں ابتدائی فتوحات کے بعد جن میں متعدد عیسائی ممالک مسلمانوں کے کنٹرول میں آگئے جواب بھی مسلمانوں کی اکثریت کے ممالک کہلاتے ہیں، پوپ نے پورے یورپ میں یہ جذبہ پیدا کردیا کہ یہ ممالک ہمیں اپنے قبضہ میں لینا چاہئے، اس کے لیے تین سو سال تک جنگیں ہوئیں، ان جنگوں میں وہ مقصد حاصل نہیں ہوا۔

اس عسکری مہم میں ناکامی کے بعد فرانس کے بادشاہ لوئی نہم نے مشورہ دیا کہ اس مقصد کے حصول کے لیے ہمیں علم کا راستہ اپنانا چاہئے، اس کے لیے مسلمان ملکوں میں تعلیمی اداروں کا جال پھیلا دیا گیا، اس کے ساتھ مشنری کام کے لیے ایک زبردست نٹ ورک قائم کیا گیا۔

خلافت عثمانیہ اور مغل سلطنت کے زوال کے بعد اس کے ماتحت ملکوں پر مغربی ملکوں نے قبضہ کرلیا، کہیں براہ راست اور کہیں مشیر اور سرپرست کی حیثیت سے، اس عہد

میں انہوں نے اپنا اثر ونفوذ اور برتری کو تعلیم یافتہ ذہنوں پر مسلط کر دیا اور ایک ایسی جماعت تیار کر دی جس کے بارے میں گب نے لکھا ہے کہ ان کے نام مسلمانوں کے ہیں لیکن ذہن اور ذوق ہمارے ذہن اور ذوق کے مطابق ہیں، انہی میں بعض شخصیتوں کے نام تک ان کے قائدین نے لیے، جو مغرب کے مفاد کے مطابق سوچتے اور عمل کرتے تھے۔

آزادی کی تحریک کے بعد جن لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار آیا وہ اسی نظام کے پروردہ تھے، اس طرح یورپ پہلے علمی راستہ سے، پھر عملی طور پر پھر اپنے تربیت یافتہ قائدین کے ذریعہ مسلم ملکوں کے نظام پر اثر انداز ہوتا رہا اور اپنے کنٹرول کو قائم رکھنے کے لیے متعدد تحریکوں، افکار ونظریات کے حاملین کو تیار کرتا رہا اور ایسے حالات پیدا کرتا رہا جن کے ذریعہ وہ مداخلت کر سکے، اور ان ملکوں کی سیاست پر اثر انداز ہو سکے۔

اور جب بھی اسلامی شعور بیدار کرنے کے لیے کوئی تحریک اٹھی تو یورپ کے منتخب کردہ قائدین نے اسے سختی سے کچل دیا اور اسلام پسندوں کے اقتدار میں آنے کے راستے مسدود کر دیے۔

اسلامی ملکوں میں جو انقلابات آتے رہے، اگر ان کی تحقیق کی جائے یا جو حوادث پیش آتے رہے، ان کی تہ میں جایا جائے، تو مغربی طاقتوں کا اس میں دخل اور تحریک کو تلاش کرنا مشکل نہیں۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے مغرب کو خطاب کرتے ہوئے مغرب کے اس مزاج اور اس کی حکمت عملی کے نتیجہ واثر کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ فرماتے ہیں:۔

''اس وقت صورت حال یہ ہے کہ ہم علم مغرب سے لیتے ہیں، زندگی کا معیار مغرب سے لیتے ہیں، یہاں تک ہم دینی نظریات اور دینی تحقیقات بھی مغرب سے لیتے ہیں، اس وقت علوم اسلامیہ میں بھی انہی مغربی یونیورسٹیوں کی نظر دیکھی جاتی ہے، مستشرقین کا لوہا نہ صرف مغرب میں؛ بلکہ مشرق میں بھی مانا جاتا ہے اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ

مستشرقین جو کہہ دیں وہ حرف آخر ہے، اور اس پر کسی تبصرہ کا کوئی جواز نہیں، یہ وہ صورت حال ہے جس سے اس وقت کوئی اسلامی ملک مستثنیٰ نہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ حقیقی آزادی سے فائدہ اٹھانے کا ان ملکوں اور قوموں کو ابھی تک موقع نہیں مل سکا، ان کے دماغوں پر مغرب کے تفوق، مغرب کے نظریات اور زندگی کے مغربی نقطۂ نظر کا اتنا بڑا بوجھ رکھا ہوا ہے کہ اس بوجھ کے نیچے یہ قومیں دبی بلکہ کچلی جارہی ہیں، بعض ایسے بھی خوش قسمت ملک ہیں کہ وہاں کی کل آبادی مسلمان ہے، لیکن انہوں نے ابھی تک اپنی زندگی کا کوئی ایسا نقشہ نہیں بنایا جو ان کے معتقدات اور ان کے مسلمات کے مطابق ہو، وہ ذہنی انتشار میں مبتلا ہیں، جس کا نتیجہ سوائے کمزوری اور پراگندگی اور سوائے بے اعتمادی اور کشمکش کے کچھ اور نہیں ہوسکتا۔

ایک اور بڑی کشمکش ان ملکوں میں یہ برپا ہے کہ ان ملکوں کی زمام قیادت یعنی ان کی باگ ڈور جن کے ہاتھ میں ہے، وہ مغربی نظریات پر پورا پورا عقیدہ رکھتے ہیں، گو ان کا نام مسلمانوں کا ہے، ان کی رگوں میں مسلمانوں کا خون ہے، وہ بہت اچھے اور قابل فخر خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں، ان کو اسلام سے انکار بھی نہیں، لیکن ان کا ذہن، ان کا عقیدہ بالکل مغربی سانچہ میں ڈھلا ہوا ہے''۔ (مغرب سے کچھ صاف صاف باتیں، ص: ۱۴۱-۱۴۲، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ، ۲۰۱۱ء)

ہمارے اس مجموعہ مضامین میں مغرب کی تاریخ اور اس کی متعدد تحریکوں اور افکار ونظریات پر روشنی ڈالی گئی ہے، ندوۃ العلماء میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے ''المعهد العالي للدعوة والفكر الإسلامي'' کا شعبہ قائم کیا، تو اسی معہد کے طلبہ کے لیے یہ مضامین لکھے گئے ہیں، ان میں زیادہ تر عربی مراجع سے ماخوذ ہیں، اصلاً یہ عربی میں لکھے گئے اور پھر اردو میں ترجمہ ہوئے، ان میں سے اکثر کا ترجمہ عزیزی مولوی محمد وثیق ندوی نے کیا ہے اور انہوں نے ہی اس مجموعہ کو مرتب کیا ہے، اس میں یورپ کے قدیم عہد، قرون وسطی اور نشأۃ ثانیہ تینوں دور کا تعارف کرایا گیا ہے، یہ مضامین موجودہ حالات سے پہلے

لکھے گئے تھے، مگر ان کی روشنی میں حالات حاضرہ کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے اور سازشوں اور تحریکوں کو سمجھنے میں ان سے مدد ملے گی۔

میں شکر گزار ہوں برادر معظم ومکرم جناب مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کا کہ انہوں نے اس مجموعہ پر ایک قیمتی تقریظ لکھی، اسی طرح میں شکر گزار ہوں جناب پروفیسر سجاد احمد صاحب کا جنہوں نے نہ صرف یہ کہ اس مجموعہ کو دیکھا؛ بلکہ ایک وقیع مقدمہ بھی تحریر فرمایا جس سے اس کتاب کی قیمت میں اور اضافہ ہوا، جزاہما اللہ خیر الجزاء۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ مجموعہ مضامین یورپ کو سمجھنے میں مفید اور معاون ہو۔

محمد واضح رشید حسنی ندوی
ندوۃ العلماء لکھنو
۶/ذوالحجہ ۱۴۳۶ھ
۲۱/۰۹/۲۰۱۵ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

(حضرت مولانا) سید محمد رابع حسنی ندوی، ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

الحمد للّٰہ رب العالمین، و الصلاۃ و السلام علیٰ سید المرسلین خاتم النبیین سیدنا محمد، و علیٰ آلہ و صحبہ أجمعین:

مولانا محمد واضح رشید حسنی ندوی صاحب صرف علم دین کے حامل اور دینی شخصیت ہی نہیں؛ بلکہ انہوں نے جدید تعلیم بھی ضروری حد تک حاصل کی اور جدید تعلیم کے حلقہ میں ایک خاصہ وقت گذارا اور ان کو اس طرح عالمی حالات اور موجودہ عہد کے تقاضے اور مشکلات کو سمجھنے کا موقع ملا اور اس ضمن میں مغربی فکر اور سامراجی وغیر سامراجی منصوبہ بندیوں سے واقفیت حاصل ہوئی، بلکہ اس سلسلہ میں عالم اسلام کو جن مشکلات کا سامنا ہے، اس کو گہرائی سے انہوں نے سمجھا۔

ان کی اس خصوصیت کی بنا پر ندوۃ العلماء میں جہاں کے وہ فیض یافتہ بھی ہیں، وہ فکر اسلامی کے تقابلی مطالعہ کے شعبہ (المعہد العالی للدعوۃ والفکر الاسلامی) کے سربراہ کے منصب پر بھی فائز ہیں، اور اس موضوع پر بحث وتحقیق کے طلباء میں ان کا درس ہوتا ہے، ان کے پاس اس موضوع پر مشتمل اچھا مواد اکٹھا ہو گیا ہے، اس کو دیکھتے ہوئے ان سے اجازت لے کر ان کے ایک شاگرد عزیزی مولوی محمد وثیق ندوی نے حالات حاضرہ کے پس منظر میں ان کے چشم کشا مضامین کو اکٹھا کر کے ایک مجموعہ تیار کر دیا، جو موضوع کی یکسانیت کی بنا پر ایک متعین موضوع کی کتاب بن گئی ہے، اس سے قبل بھی اسی طرز کے ان کے بعض

دیگر مضامین نے بھی کتاب کی صورت اختیار کی تھی۔ یہ تازہ کتاب اس سلسلہ میں ایک اچھے کام کا اضافہ ہے۔

مغربی ممالک نے اس دنیا میں اپنے کو صرف عسکری طاقت تک محدود نہیں رکھا ہے، بلکہ سیاسی حکمت عملی کے موثر ذرائع منصوبہ بندی کی سطح پر اختیار کیے، ان ذرائع کی بنا پر مشرقی ملکوں کی سرزمین پر اقتدار حاصل کرنے کے ساتھ وہاں کے باشندوں کے دماغوں پر بھی قبضہ کیا، ان کا اس سرزمین پر قبضہ سیاسی اور عسکری حکمت عملی اور دماغوں پر قبضہ تعلیم وذرائع ابلاغ کے ذریعہ ہوا، چنانچہ مشرقی دنیا کا بیشتر حصہ ان کے قبضہ میں چلا گیا، ہمارے مشرقی ممالک ان مغربی طاقتوں کے سامنے بے بس ہوگئے، ان کی بے بسی کی بڑی وجہ مغرب کے سامراجی منصوبوں کے خطرات کی طرف سے بے توجہی اور ان کا فکری غلبہ ہے، اس کو سمجھنا اور اس کے علاج کی فکر کرنا ہماری بنیادی ضرورت ہے، اس سلسلہ میں مولانا محمد واضح رشید حسنی ندوی صاحب نے مفید نشاندہی کی ہے، اس طرح یہ کتاب موجودہ حالات کے اسباب ونتائج کے سمجھنے کے سلسلہ میں بہت مفید ہے، میں اس کے لیے اپنی قدردانی کا اظہار کرتا ہوں۔

محمد رابع حسنی ندوی

ندوۃ العلماء لکھنو

۵/ذوالحجہ/۱۴۳۶ھ

۲۰۱۵/۹/۱۹ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفے چند

پروفیسر احمد سجاد، سابق صدر شعبہ اردو رانچی یونیورسٹی، رانچی

مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی صاحب (ایجوکیشن ڈائرکٹر ندوۃ العلماء، لکھنؤ اور سکریٹری رابطۂ ادب اسلامی) علمی دنیا میں محتاج تعارف نہیں، موصوف عربی، اردو اور انگریزی زبانوں میں نصف صدی سے گرانقدر خدمات انجام دیتے آرہے ہیں، آپ کے مضامین کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ عالمی وملکی تناظر میں اخلاقی واسلامی قدروں کے تحت موضوعات کا تجزیہ وتحلیل مدلل انداز میں کرتے ہیں، اور کیوں نہ کریں کہ موصوف جس خانوادہ سے تعلق رکھتے ہیں، اسلام کی نشاۃ ثانیہ، دین کی سربلندی اور دعوت وعزیمت کی چارسوسالہ شاندار تاریخ میں اس کے انمٹ نقوش ملی واسلامی تاریخ کا روشن باب بن چکے ہیں، تکیہ رائے بریلی کے حضرت علم اللہؒ اور تیرہویں صدی ہجری کے مجاہد اعظم حضرت سید احمد شہیدؒ سے کون واقف نہیں۔

چنانچہ پیش نظر مجموعہ مضامین میں مولانا موصوف نے بالخصوص مغربی فلسفۂ زندگی وسیاست کے نتیجے میں مشرق ومغرب کی پوری انسانیت اور امت مسلمہ جس طرح بدترین ظلم وستم اور جبر واستحصال کا شکار ہورہی ہے، اپنے مطالعہ ومشاہدہ کی روشنی میں بڑے مدلل اور مؤثر انداز میں انہیں واشگاف کیا ہے۔

عصر حاضر کی سب سے بڑی لعنت ''سیکولرزم'' اور ملحدانہ جمہوریت نے نوسرمایہ

دارانہ سامراجیت کی جو شکل اختیار کرلی ہے اس نے پوری انسانیت کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا ہے، اس کے پس پردہ صلیبی و یہودی ذہنیت نے روح کے بجائے مادہ، خدا کے بجائے کائنات، غیب کے بجائے ٹھوس حقائق کی الٹی منطق کو سارے جہان پر مسلط کرنے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں بحیثیت مجموعی عملاً آخرت پر دنیا تقریباً مقدم ہو چکی ہے، ان تلخ حقائق کو مولانا موصوف نے اپنے مضامین ''سیکولرزم کیا ہے، جمہوریت اور سیکولرزم، سامراجیت کا نیا حلقہ، روس اور سامراجیت، یورپ کی صلیبی ذہنیت'' وغیرہ میں واضح کر کے ''دانشوروں کی ذمہ داری'' کے زیر عنوان انہیں جھنجھوڑنے کی کامیاب سعی کی ہے، اس ضمن میں ''سیاسی و دینی تحریکات کے بنیادی فرق'' اور ''مغرب کی مذہب دشمنی'' کی حقیقتوں کو بھی کھول کر رکھ دیا ہے، آزادی کے نام پر دنیا کے عوام کو جس طرح غلام بنایا جا رہا ہے اور آزادیٔ نسواں کے نام پر عورتوں کو جس طرح ہوس کا شکار بنایا جا رہا ہے، انہیں بھی مصنف نے واشگاف کیا ہے، سچ پوچھیے تو مغرب کی الحادی اور سودی نظام سیاست و معیشت اور معاشرت نے ساری دنیا کی طرح خود انہیں بھی زار و زبوں کر رکھا ہے، قرآن پاک کی تنبیہ ان کے لیے حرف بحرف صحیح ثابت ہو رہی ہے:

''یمحق الله الربی ویربي الصدقات والله لا یحب کل کفار أثیم'' (البقرة:۲۱۲)

اللہ سود کا مٹھ مار دیتا ہے اور صدقات کو نشو و نما دیتا ہے اور کسی ناشکرے، بدعمل کو پسند نہیں کرتا''۔

بیشتر مسلم ممالک بھی چونکہ اسی مغربی سودی نظام کے فریب میں طوعاً و کرہاً آ چکے ہیں اس لیے مغرب سے بھی زیادہ مشرق کا حال خراب ہے، عصری بے خدا سیاست و معیشت نے ساری دنیا کو لوٹ کھسوٹ کا ذریعہ بنا دیا ہے، چنانچہ اعداد و شمار اور ٹھوس حقائق سے کرۂ ارضی کی تباہی کی تفصیلات اب کسی سے پوشیدہ نہیں رہیں، ۱۹۹۸ء کی رپورٹ

UNDP میں انسانی ترقی کے حوالے سے معاشی ناہمواری اور بنیادی سہولتوں کی فراہمی میں جو روح فرسا تفصیل پیش کی ہے اس کی ایک جھلک آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

دنیا کے صرف 20% امیر ترین ممالک کی آبادی زندگی کی تمام سہولتوں سے مالا مال ہے، مگر 60% فیصد کو دو وقت کی روٹی بھی نصیب نہیں، دنیا بھر میں تیار ہونے والی 45% غذائی اشیاء 86% فیصد موٹر گاڑیاں، 74% ٹیلیفون اسی 20% امیر ممالک کا حصہ ہیں، اس کے مقابلے میں 60% غریب ترین آبادی کے حصے میں غذائی اشیاء کا صرف 4%، موٹر گاڑیاں صرف 1%، ٹیلیفون صرف 1.5% کے بقدر دنیا کے صرف تین امیر ترین افراد کی دولت 48 غریب ترین ممالک کی مجموعی قومی پیداوار کے برابر ہے، تنہا بل گیٹس کی دولت پورے ملک ہندوستان کی دولت سے کہیں زائد ہے، امیری اور غریبی کے درمیان اس ہمالیائی فرق کا دنیا نے آج تک گمان بھی نہیں کیا تھا، اس کے باوجود عالمی لوٹ کھسوٹ، کرپشن اور گھوٹالوں کی غریبوں کی طرح امیر ملکوں میں بھی بہار آئی ہوئی ہے، جبکہ نیوکلیر ٹکنالوجی، بایوٹکنالوجی اور مائیکرو ٹکنالوجی وغیرہ کے ذریعہ جو سائنسی انقلاب اور علمی دھماکے کے غلغلے سے کان بہرے ہو رہے ہیں، علامہ اقبالؔ نے سچ کہا تھا کہ:

یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت
پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیم مساوات

اس یکر خا علمی و سائنسی، سیاسی و معاشی استبداد نے موجودہ صدی کو چھ انتہائی ہولناک مسائل سے دوچار کر دیا ہے، جس پر اب مشرق سے زیادہ مغرب کو فکر لاحق ہو چکی ہے۔

اور وہ لاینحل مسائل ہیں:

۱- فضا کی آلودگی (Ecological Pollution)

۲- منشیات کا پھیلاؤ (Drug Addiction)

۳- افراط زر (Inflation)

۴-ناخواندگی کا سیلاب (Flood of Illiteracy)

۵-نئی نسل کی بے راہ روی (Errata New Generation)

۶-اور جدید امریکی سامراجیت (New American Imperialism)

غور کیا جائے تو ان میں سے متعدد مسائل پر عالمی وسائل کا ایک قلیل حصہ صرف کر کے بخوبی قابو پایا جاسکتا ہے، مگر جدید مادی تہذیب ان مسائل کو حل کرنے میں مخلص نہیں، ایک تخمینہ کے مطابق اگر دس سال تک منصوبہ بند انداز میں ہر سال صرف سات بلین ڈالر خرچ کیا جائے تو دنیا بھر سے جہالت کا خاتمہ کیا جاسکتا ہے، جبکہ امریکہ میں سالانہ کوسمیٹک کا خرچ یا یورپ میں آئس کریم اور کولڈ رنک پر سالانہ خرچ سات بلین سے بھی زائد کا ہے، مزید یہ کہ دنیا بھر میں فوجی اخراجات کا صرف 1/10 حصہ کم کر کے تعلیم پر خرچ کر دیا جائے تو عالمی خاتمۂ جہالت کے لیے یہ کافی ہوگا، مگر اتنا ایثار بھی موجودہ مادہ پرستانہ تہذیب کے لیے ممکن نہیں، جس کی ایک بڑی وجہ تو یہ ہے کہ ان مسائل کا حل جس امت کے پاس ہے اس کے خلاف عالمی صلیبی نوعیت کی جنگ چھیڑی جا چکی ہے، افغانستان وعراق پر ظالمانہ حملہ سے پہلے بیسوں برس سے مغربی تھنک ٹینک خواہ ہنٹنگٹن ہوں یا فرانسس فوکیاما ''تہذیبی تصادم'' کے شیطانی نظریہ سے متاثر تھیچر کا بیان ریکارڈ ہو چکا ہے کہ:

''اب مغربی تہذیب کے لیے اشتراکیت سے بڑا خطرہ یعنی اسلام موجود ہے، اور ناٹو کے جنرل سکریٹری جان کالفن کی ابلیسی پیشن گوئی صحیح ثابت ہو چکی ہے کہ: ''دریا سویرا اسلام اور ہمارے درمیان کشمکش کا ایک نیا دور شروع ہوگا'' جو شروع ہو چکا ہے، مگر اس ظالمانہ سازش سے صرف امت مسلمہ کا نہیں، خود یہ نام نہاد ترقی یافتہ ممالک اور قومیں بھی تباہ و برباد ہو رہی ہیں، حد تو یہ ہے کہ ۳۰ کروڑ آبادی والے ملک امریکہ میں بھی تین کروڑ کی آبادی خط افلاس (BPL) سے نیچے جینے پر مجبور ہے، ۲۰۰۰ء میں یہ تعداد ایک کروڑ سے تجاوز کر گئی، سال بھر کی کرائم رپورٹ یہ ہے کہ 20% لڑکیاں اور 10% امریکی لڑکے ایک نہ

ایک بار خودکشی کی کوشش ضرور کرتے ہیں، سالانہ ایک لاکھ سے زائد لڑکیوں کی عصمت دری ہوتی ہے، شراب نوشی، جوا اور عیاشی کی تو کوئی انتہا ہی نہیں ہے۔

اس عالمی تناظر میں مولانا واضح رشید ندوی صاحب کے ان قیمتی اور خیال انگیز مضامین کا مطالعہ کیا جائے تو ان میں عبرت و موعظت کا وافر ذخیرہ موجود ہے۔

احمد سجاد
سابق پروفیسر، صدر شعبہ اردو،
وڈین فیکلٹی آف ہومینیٹز
رانچی یونیورسٹی، رانچی
جھارکھنڈ

مورخہ ۱۶/جون ۲۰۰۶ء

موجودہ تہذیب اور انسان

مغربی تہذیب ایک ترقی پذیر تہذیب ہے، جس میں سکون اور ٹھہراؤ نہیں، اس کی ترقی کی راہ میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں بن سکتی ہے، اخلاقی اور انسانی قدریں اس کی نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں، اگر وہ ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنیں تو انھیں قربان کیا جاسکتا ہے، بلکہ اس تہذیب کے علمبرداروں کی نگاہ میں انسانی قدریں ایک فرسودہ تصور ہے، جو ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے، اس لیے موجودہ تمدن میں سب سے بڑی جو قربانی پیش کی جاتی ہے وہ اخلاق اور اقدارِ زندگی کی قربانی ہے، موجودہ سیاست کے بانی میکاویلی Machiavelli کے نزدیک اپنے مقصد کے حصول کے لیے ہزاروں انسانوں کا خون بہایا جاسکتا ہے، اور اپنے مقصد کے خاطر جائز و ناجائز ہر طرح کے وسائل اختیار کیے جاسکتے ہیں۔

اگرچہ موجودہ عہد میں سب سے زیادہ ذکر انسان اور انسان کے حقوق کا کیا جاتا ہے، لیکن حقیقت کیا ہے؟ وہ موجودہ تہذیب کے علمبرداروں کے اس سلوک سے ظاہر ہے جو وہ انسانوں کے ساتھ کرتے ہیں، وہ انسانوں پر اعتماد کم اور مشین پر اعتماد زیادہ کرتے ہیں، عام کاروبار میں مشینوں کے استعمال نے لاکھوں انسانوں کو بے مشغلہ اور بے کار کر دیا ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ انسانوں کی جگہ مشین لے رہی ہیں، کمپیوٹر کا استعمال جس تیزی سے بڑھا ہے، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ہر کام کمپیوٹر سے لیا جارہا ہے، سوچنے، حساب لگانے، پڑھنے پڑھانے اور دوسرے سارے کام کمپیوٹر سے لیے جارہے ہیں، ہر شخص اس کا محتاج ہے، ذہنی صلاحیتیں استعمال نہ ہونے سے کم ہورہی ہیں، کتنے ہوائی اڈے اور دوسرے

سرگرم اور متحرک کارخانے اور ادارے ہیں جہاں کمپیوٹر نے انسان کی جگہ لے لی ہے، خطرناک فوجی تنصیبات اور ذرائع ابلاغ بھی کمپیوٹر کے ماتحت ہیں۔

مغربی تہذیب انسان کو کس نظر سے دیکھتی ہے، اس کا اندازہ اس کی سیاسی تاریخ اور علمی تصورات سے کیا جاسکتا ہے، سیاسی تاریخ اس کی رومی عہد سے سامراجی اور استبدادی ہے، علمی لحاظ سے اس کے دانشور، انسان کے حیوان الاصل ہونے کے قائل ہیں، موجودہ عہد میں بھی مختلف ملکوں میں سرمایہ دار اور اشتراکی نظاموں کی جابرانہ پالیسیوں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے نزدیک انسان کا کوئی احترام نہیں ہے، اس سے زیادہ حیوان قابل احترام ہے، شاید اس لئے کہ انسان کے اندر احساس وشعور اور اپنے دفاع کی صلاحیت وقوت موجود ہے، اس لئے اسے کسی قسم کی حفاظت، پناہ اور احترام کی ضرورت نہیں ہے، اس نے انسان کو صنعتی اور تہذیبی ترقیوں کا ایندھن بنالیا ہے، اس پر مہلک تجربے کیے جاتے ہیں، اس کے ذہن اور دماغ کو متاثر کرنے کے لئے اذیت کے نئے نئے وسائل اور مشینیں ایجاد کی جاتی ہیں، اور مختلف ملکوں میں انکو رائج کیا جاتا ہے، اس کو اپنے عقیدہ اور مرضی کے مطابق صاف اور پاکیزہ زندگی گذارنے کے حق سے محروم کیا جاتا ہے، اور اس کی مرضی کے خلاف نظریات اور نظام زندگی کا پابند بنایا جاتا ہے، مویشیوں اور بکریوں کے گلہ کی طرح اس کو ہانکا جاتا ہے۔

مغرب اپنے علاوہ ہر انسانی معاشرہ اور ہر نظریہ اور تصورِ حیات کو صرف نا قابل تسلیم اور نا قابل احترام ہی نہیں؛ بلکہ نا قابلِ بقا سمجھتا ہے، وہ انسان کو کس نظر سے دیکھتا ہے، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے نظام کی بقا کے لیے دوسرے انسانوں کے خلاف مہلک اور تباہ کن ہتھیار تیار کرنے میں مصروف ہے، ان میں بعض ایسے ہتھیار ہیں جن کا مقصد صرف انسان کی تباہی ہے، اس طور پر کہ صنعتی اداروں اور مراکز کو اس سے کسی قسم کا نقصان نہ ہونے پائے، اس کی واضح دلیل نائیٹرون (Neutron) بم کے

موجد(Samuel Cohen) کا وہ بیان ہے جو اس نے ایک ٹیلیویژن انٹرویو میں دیا تھا، اس نے کہا کہ اس کے بم کی خوبی یہ ہے کہ وہ صرف انسانوں کو فنا کرے گا، صنعتی اداروں کو اس سے کوئی نقصان نہیں ہوگا، اس نے یہ بھی کہا کہ انسان چونکہ جنگ کرتا ہے، اس لیے وہی قتل کا مستحق ہے، ان اداروں کی کوئی خطا نہیں ہے جس کی پاداش میں ان کو تباہ و برباد کیا جائے۔

اخباری بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف امریکا کے پاس بیالیس ہزار ٹن کیمیائی ہتھیار ہیں، ان بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسانوں کے لیے مہلک اور تباہ کن جنگی ہتھیاروں کی ذخیرہ اندوزی کے معاملہ میں روس امریکہ سے بڑھا ہوا ہے، روس کے مہلک کیمیائی ہتھیار ۳۵۰ ہزار ٹن کے قریب ہیں، ان بیانات سے یہ حقیقت بھی کھلتی ہے کہ دونوں ملکوں کی فوجوں نے عام ہتھیار چھوڑ کر کیمیائی ہتھیاروں کا استعمال شروع کر دیا ہے۔

ان بیانات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کیمیائی ہتھیاروں کا نشانہ صرف انسان ہے، ان کیمیائی ہتھیاروں کے استعمال کے نتیجہ میں انسان دست، قے، دماغی خرابی اور اندرونی اضطراب و بے چینی کا شکار ہو جاتا ہے، نیند سے محروم ہو جاتا ہے، اعصاب اس کے بے کار ہو جاتے ہیں، آنکھ کی روشنی اس کی جاتی رہتی ہے، اور سینہ و سر میں سخت تکلیف اور درد ہوتا ہے، آخر کار یا تو وہ انسان مر جاتا ہے یا مردوں کی سی زندگی گذارتا ہے۔

۲۰۰۴ء میں عراق کے شہر فلوجہ پر امریکہ نے جو ایٹمی بمباری کی تھی اس کے نتیجہ میں خطرناک اور مہلک بیماریاں پیدا ہو گئی ہیں، جن میں سرفہرست کینسر کا مرض ہے، امریکی صحافی رابرٹ کوہلر کی رپورٹ کے مطابق فلوجہ پر امریکی بمباری کے بعد جو بچے پیدا ہو رہے ہیں، وہ عجیب الخلقت ہیں، کسی کا سر نہیں ہے، تو کسی کے دو سر ہیں، کسی کی ایک آنکھ پیشانی میں ہے تو دوسری غائب، یا نومولود بچوں کے اعضائے جسمانی کٹے ہوئے یا بعض اعضاء بالکل جھلسے ہوئے ہیں، یہ بچے جلد ہی موت کی نیند سو جاتے ہیں یا جوں جوں بڑے ہوتے جاتے ہیں بھیانک اور ڈروانی شکل اختیار کر لیتے ہیں، اور بلڈ کینسر کا شکار ہو جاتے

ہیں۔رابرٹ کوہلر نے لکھا ہے کہ فلوجہ میں ایٹمی بمباری کے بعد شیر خوار بچوں کی وفات کا تناسب ۱۹۴۵ء میں ہیروشیما اور ناگا ساکی پر پھینکے گئے ایٹم بم کے نتیجہ میں ہونی والی اموات سے کئی گنا زیادہ ہے،اور یہاں پر تیزی سے کینسر خصوصاً بلڈ کینسر نے وبا کی شکل اختیار کرلی ہے۔اور جس طرح جاپان میں ایٹم بم گرانے کے بعد لڑکوں اور لڑکیوں کی ولادت کے تناسب میں فرق آگیا تھا اسی طرح کی صورت حال فلوجہ شہر میں پیش آرہی ہے،لہٰذا فلوجہ پر ایٹمی بمباری سے پہلے لڑکوں کی شرح پیدائش ۱۰۵۰ تھی، اور لڑکیوں کا تناسب ۱۰۰۰ تھا،لیکن بمباری کے بعد لڑکوں کی شرح پیدائش ۸۶۰ ہوگئی ہے جبکہ لڑکیوں کی شرح پیدائش ۱۰۰۰ ہے۔

گذشتہ جنگ عظیم میں جاپان کے شہروں پر جو ایٹم بم پھینکا گیا تھا،اس کی وجہ سے اس وقت انسانی جانوں کو جو نقصان پہنچا وہ تو پہنچا،آج بھی انسانوں کی ہلاکت کا وہ سلسلہ جاری ہے،فضا میں باقی ماندہ ایٹمی اثرات سے مرنے والوں کی تعداد دسیوں ہزار سے زیادہ ہوچکی ہے۔

کویت سے شائع ہونے والے عربی مجلّہ ''المجتمع'' نے امریکی محقق ڈاکٹر جی آر البیریلی (J.R. Albarelli) کی ایک رپورٹ شائع کی ہے،جس میں کہا گیا ہے کہ آج کل جو مختلف نئی نئی جان لیوا بیماریاں سامنے آرہی ہیں یہ سب ان ایٹمی اور بایولوجیکل (Biological) تجربات کا نتیجہ ہیں جو وقتاً فوقتاً عالمی طاقتیں کرتی رہتی ہیں، امریکہ نے ایک نیا زہریلا ''کیمٹر ایل'' (Chemtrail) ایجاد کیا ہے جس کے استعمال سے خطرناک زلزلے اور حوادث برپا کئے جاتے ہیں اور انسانی زندگی تباہ کردی جاتی ہے، رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ایڈز، کینسر، بلڈ کینسر، دل کی بیماری، گردہ کی بیماری، تنفس کی بیماری، سوائن فلو، برڈ فلو، سارس، ڈینگو بخار، چکن گنیا جیسے خطرناک امراض زہریلے کیمیکل اور ایٹمی ذرات کے ذریعہ دنیا میں پھیلائے جارہے ہیں، جس کا مقصد متعینہ علاقوں میں انسانی آبادی کو برباد

کرنا ہے، نئے سامراج کا یہ انتہائی خفیہ اور مہلک ہتھیار ہے، اس کیمیکل کے ذریعہ کہیں سخت ترین ٹھنڈک اور کہیں سخت ترین گرمی پیدا کی جاتی ہے جیسا کہ کوسوو، تورابورا اور شمالی کوریا میں کیا گیا، کوسوو میں سردی کے موسم میں سخت ترین ٹھنڈک پیدا کردی گئی جس کے نتیجہ میں کوسوو کی بڑی آبادی ہلاک ہوگئی، افغانستان میں تورابورا پہاڑی کو خشک کردیا گیا جس کی سے وجہ پہاڑی پر رہنے والی آبادی نقل مکانی پر مجبور ہوگئی، شمالی کوریا میں اس کیمیکل کو استعمال کیا گیا جس کے نتیجہ میں صرف دوسال کی مدت میں ۶ ملین بچے اور ۸ ملین نوجوان ہلاک ہوگئے، رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ امریکہ میں ہیٹی کا زلزلہ اسی کیمیکل کے تجربہ کا نتیجہ ہے۔ ماحولیاتی تبدیلی اور گلوبل وارمنگ بھی بایولوجیکل اور ایٹمی تجربات کا نتیجہ ہے۔ کیمٹرایل کیمیکل کے استعمال سے کہیں زوردار بارش کرائی جاتی ہے کہ سیلاب آجاتا ہے اور کہیں فضا میں پانی روک کر خشکی پیدا کی جاتی ہے جیسا کہ روس نے ۲۰۰۵ء میں دوسری جنگ عظیم کے ساٹھویں جشن کے موقع پر کیا تھا، خلیجی جنگ میں بھی اس کیمیکل کا استعمال کیا گیا تھا جس کی وجہ سے ۴۷٪ فیصد امریکی فوجی مہلک بیماریوں کا شکار ہوگئے تھے۔ ابھی حالیہ چند سالوں میں مصر اور شمالی افریقہ میں جو سخت ترین گرمی پڑی اس کے پیچھے بھی اس کیمیکل کا تجربہ شامل تھا، امریکہ کے پاس اس وقت چار خطرناک کیمیائی پروگرام ہیں، جن کا مقصد دنیا کے ماحولیاتی نظام اور جغرافیائی نظام میں خرابی پیدا کرکے سامراجی مقاصد کو بروئے کار لانا ہے۔

امریکی قومی سلامتی کونسل کے سابق سربراہ ہنری کیسنجر نے امریکی انتظامیہ کو مشورہ دیا تھا کہ امریکہ کی بقا کے لئے تیسری دنیا کے ممالک میں انسانی آبادی کو کم کرنا بہت ضروری ہے، کیونکہ ہماری اقتصادیات بہت ہیں، اور ہمیں خارجی دنیا کے معادن اور ذخائر کی شدید ضرورت ہے، خاص طور پر وہ ممالک جو اپنے معدنی ذخائر کو استعمال کرنے پر قادر نہیں ہیں، اس طریقہ سے ہم ان ممالک میں اقتصادی، سیاسی اور سماجی استقرار کو مضبوط

کریں گے اور آبادی کی کمی سے اس استقرار کے امکانات اور زیادہ قوی ہو جائیں گے، اس لئے تیسری دنیا کی آبادی کا مسئلہ امریکہ کے اقتصادی مفادات اور قدرتی ذخائر کے لئے اہم مسئلہ ہے۔ لہذا امریکہ نے ایسا ہی کیا ہے اور تیسری دنیا کے ممالک کو کیمیائی اور بایولوجیکل ہتھیار سپلائی کئے۔ جیسا کہ عراق ایران جنگ کے موقع پر امریکہ نے عراق کو یہ مہلک ہتھیار بہم پہونچائے اور جنگ سے پہلے امریکہ، روس اور چین نے عراق کو کیمیائی ہتھیار سپلائی کیے۔

انسان دشمن اور جنگ دوست مغرب دوبارہ جنگ کی تیاری میں مصروف ہے، کیمیائی اور ایٹمی ہتھیاروں سے لیس فوجی نقل وحرکت مختلف علاقوں میں جاری ہے، سمندر اور دریا کی اس نقل وحرکت کا میدان بننے کی وجہ سے زہریلی گیسوں کے اثرات سے آلودگی بڑھتی جارہی ہے، ایٹمی تجربوں نے فضا کو ایسا مسموم کر دیا ہے کہ انسان کے استعمال کی ہر چیز متاثر ہونے لگی ہے جس کی وجہ سے طرح طرح کے لاعلاج امراض پیدا ہو رہے ہیں، ان میں ایک نیا مرض مارگیولنس (Morgellons) ہے جس کا اثر جسم کے جوڑوں میں ظاہر ہوتا ہے، قوت حافظہ ختم ہونے لگتی ہے اور اس مرض میں مبتلا مریض کو ایک عجیب بے چینی ہوتی ہے کہ کھال کے نیچے کوئی چیز کاٹ رہی ہے۔

اقتدار اعلیٰ کی ہوس اور رسہ کشی نے ہر شہر اور ہر علاقہ میں انسانوں کو خطرات کا نشانہ بنا دیا ہے، بڑی بڑی طاقتوں نے اپنے زیر اثر علاقوں کی حکومتوں کو اپنا غلام بنالیا ہے، اور دوسرے علاقوں پر اعلانیہ اور خفیہ طور پر قبضہ کر کے اپنے اثر ونفوذ کی توسیع میں مشغول ہیں، کیونکہ یورپ کا سفید فام انسان جس نے سائنس اور ٹکنالوجی کی راہ میں بڑے بڑے معرکے سر کیے ہیں، وہ ساری دنیا پر اپنا حق سمجھتا ہے، اور دوسرے لوگوں کو ایک خاص طرز زندگی کا پابند بنانے کی کوشش کرتا ہے، اس کے نزدیک غیر یورپی لوگ اس کے تابع اور غلام ہیں اور وہ ان کی زندگی، موت اور آبرو کا مالک ہے۔

تہذیب حاضر میں انسانی احساس وشعور کا فقدان

انسان اپنی زندگی میں اپنے فہم وشعور کے مطابق عمل کی منزلیں طے کرتا ہے۔اس لیے کہ فہم وادراک اور احساس وشعور ہی انسان کا اصل امتیاز ہے اور یہی وہ چیز ہے جو انسان کو اپنی زندگی سنوارنے، کردار کو بہتر بنانے، نفس کو سنوارنے، دوسروں کے کام آنے اور ان کی خدمت کرنے کی دعوت دیتی ہے، چنانچہ جب انسان اپنے فہم وشعور کی روشنی میں کسی خیر اور بھلائی کو دیکھتا ہے تو وہ اسے اپنے کردار وعمل کے سانچے میں ڈھالتا ہے اور جب وہ کسی شر اور برائی کو دیکھتا ہے تو وہ اپنے دامن کو اس سے بچاتا ہے، ایک ہوشمند اور دانشمند انسان کی علامت یہ ہے کہ وہ اپنے تجربات ومشاہدات کی روشنی میں اپنے نفس کا محاسبہ کرے اور اپنے اور دوسروں کے موقف کے درمیان موازنہ کرے، اور پھر جو نامناسب ہو اس سے گریز کرے اور جو بہتر ہو اسے اختیار کرے، اچھا انسان اپنے مفاد پر دوسروں کے مفاد کو ترجیح دیتا ہے، اپنی راحت وآرام کو قربان کر کے دوسروں کو راحت پہونچاتا ہے، اور اپنی ذات سے کہیں زیادہ دوسروں کی بھلائی اور بہتری کا خواہاں ہوتا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اس روئے زمین پر سانس لینے والے ہر فرد میں کمی بیشی کے ساتھ شعور واحساس کا مادہ پایا جاتا ہے، اور جب انسان مہذب اور تعلیم یافتہ ہوتا ہے تو یہ شعور مزید نمایاں ہوجاتا ہے اور اس کے علم ومطالعہ کی بنا پر اسے دانشور، عالموں اور ماہرین فن کے تجربات ومشاہدات کا علم ہوتا ہے جن کے ذریعہ اس کا ذہن صاف ہوتا ہے اور اس کی فکر میں بالیدگی پیدا ہوتی ہے اور اس کے نتیجہ میں ایک تعلیم یافتہ انسان زیادہ روشن ضمیر، باریک بیں اور دانش مند ہوتا ہے اور اس کے اندر اپنے ذہن کو آلودگیوں سے پاک رکھنے

اور خود کو سنوارنے کی صلاحیت دوچند ہوتی ہے۔

احساس وشعور ہی انسان کو بلندی عطا کرتے ہیں اور ان کے ذریعہ وہ ترقی کی منزلیں طے کرتا ہے اور اسی احساس وشعور کے فقدان کے نتیجہ میں ایک انسان عروج وترقی کی صلاحیت کو کھو بیٹھتا ہے اور وہ ایک تنگ وتاریک دائرہ کے اندر مقید ہو کر رہ جاتا ہے۔

شعور کا سب سے اہم معیار خیر وشر اور خوشی وغم، اچھے برے اور خوب وناخوب کا امتیاز ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انسان کو کونسی چیز زیب دیتی ہے اور کون سی نہیں۔ اور جب انسان اس کی فہم وتمیز کھو بیٹھے کہ کون سی چیز انسانی ہے اور کون سی حیوانی، کیا خیر ہے اور کیا شر، کون سا عمل اس کے لیے مناسب ہے اور کون سا عمل اس کے لیے نامناسب؟ ایسے شخص کو انسان کہنا صحیح نہ ہوگا۔ اگر چہ وہ اپنی پیدائش اور خلقت کے اعتبار سے انسان ہو، کیونکہ اس کی شکل تو انسانی ضرور ہے لیکن عادات وخصائل اور طبیعت ورجحان حیوانی ہیں۔

اگر آج کے انسان کو اسی پیمانہ اور اسی کسوٹی پر پرکھا جائے تو بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ انسان کی اس تعریف کا مستحق نہیں ہے جو انسانی نفسیات کے ماہرین نے کی ہے۔ مذہب اور اخلاق کے حاملین کی تعریف تو اس سے بہت بلند اور اعلیٰ ہے۔

آج انسان ان تمام خصوصیات وکمالات کو کھو بیٹھا ہے جو انسان وحیوان میں تمیز کرتے ہیں، انسان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ شعور اور احساس رکھنے والا حیوان ہے، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ معاشرتی یا اجتماعی حیوان ہے لیکن آج کا انسان دونوں چیزوں سے کورا ہے، آج وہ شعور بھی کھو بیٹھا ہے اور اجتماعیت بھی، اس کی زندگی انفرادی زندگی بن کر رہ گئی ہے، وہ محض اپنی ذات کی خاطر دوڑتا اور اپنے نفع کے لیے تگ ودو کرتا ہے خواہ وہ کتنا ہی دعویٰ کرے کہ اس کی زندگی شعور وفہم سے پُر اور اجتماعیت کا مظہر ہے۔

آج مغربی تہذیب کے علمبردار یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انھوں نے انسانوں کے درمیان طبقاتی فرق کو مٹا دیا اور تمام انسانوں کو ایک لڑی میں پرو دیا ہے اور سارا جہاں ایک ملک کے مثل ہو گیا۔ مثال کے طور پر جو شخص ہندوستان میں رہتا ہے وہ امریکا کے حادثات وواقعات

سے مکمل طور پر باخبر رہتا ہے، اسی طریقہ سے جو امریکا اور یورپ میں رہتا ہے وہ چین اور مشرق وسطیٰ کی معلومات رکھتا ہے، آج ذرائع ووسائل نے دوریوں کو ختم کر دیا ہے اور مواصلاتی انقلاب نے ان جغرافیائی تقسیموں کو دور کرنے میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔ چنانچہ ان برق رفتار وسائل نے جملہ تہذیب وثقافت، زبان وادب جغرافیائی اور قومی تفریق وامتیاز کو ختم کر کے ایک ثقافت وتمدن اور قوم وملت کو جنم دیا ہے۔

آج کا انسان اس روئے زمین پر کسی بھی حصہ میں رونما ہونے والے حادثہ سے چند لمحوں کے اندر باخبر ہوسکتا ہے، لوگ دور دراز ملکوں میں ہونے والے میچ، ٹورنامنٹس اور کانفرنسوں کو بچشم خود دیکھتے ہیں اور اسی کے ساتھ لیڈروں اور سربراہوں کے مابین ہونے والے مذاکرات اور دور دراز علاقوں میں پیش آنے والے واقعات ٹیلی ویژن کی اسکرین پر انھیں براہ راست دیکھنے کو ملتے ہیں اور واقعات کے رونما ہونے کے فوراً بعد ان کی تفصیلات نشر ہوجاتی ہیں، جیسا کہ افغانستان، عراق، تونس، لیبیا اور مصر کے واقعات کا دوسرے ملکوں کے باشندوں نے مشاہدہ کیا، غریب ملکوں میں قحط سالی اور بھکمری اور جہازوں کے تصادم، ریل گاڑیوں اور بسوں کے ٹکراؤ اور اس جیسے دیگر ہزاروں واقعات وحوادث کا آئے دن لوگ مشاہدہ کرتے رہتے ہیں جو آج کل بالخصوص کچھ زیادہ ہی رونما ہونے لگے ہیں۔

آج انسان ان ہلا دینے والے حادثات اور تڑپا دینے والے واقعات اور ان کے المناک مناظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے؛ لیکن اس کی آنکھ سے کوئی آنسو گرتا ہے نہ اس کے منہ سے کوئی کراہ نکلتی ہے، اور نہ اس کے طرز عمل سے افسوس کا کوئی اظہار ہوتا ہے، وہ خالص مادی زندگی گذارتا ہے وہ محض اپنے نفع اور فائدے کی بات سوچتا ہے، اسی کے لیے وہ خون اور پسینہ بہاتا ہے، نہ تو کوئی آسمانی آفت اس کے ضمیر کو جھنجھوڑتی ہے اور نہ اس کے نتیجہ میں اس کے اندر کوئی بہتر جذبہ فروغ پاتا ہے، وہ ان انسان کی لاشوں سے گزر جاتا ہے، بلکہ اپنے قدموں تلے ان لاشوں کو روند دیتا ہے جو کسی جہاز یا ٹرین یا بس کے حادثہ میں جاں بحق ہوئے، وہ اپنی ساری فکر اس بات پر مرکوز کرتا ہے کہ کس طرح ان مردہ لاشوں

سے کوئی قیمتی چیز حاصل کرلے، وہ گھڑی حاصل کرنے کے لیے ہاتھ کاٹ دیتا ہے، بندے اتارنے کے لیے کان کاٹ دیتا ہے اور لاکٹ نکالنے کے لیے گردن کاٹ دیتا ہے۔

احساس وشعور کی یہ متاع بے بہا صرف عام لوگوں کے اندر ہی مفقود نہیں ہوئی ہے، بلکہ اس میں بڑے لیڈران اور رہنمایان قوم بھی مبتلا ہیں جو آج دنیا پر حکمرانی کررہے ہیں، اور وہ قوموں اور ملکوں کے انجام کے ذمہ دار ہیں، چنانچہ وہ ہزاروں لوگوں کی بربادی کی پروانہیں کرتے، بلکہ اس پر مستزاد یہ کہ وہ خود انسانی نسلوں کے قتل عام اور وحشیانہ مصائب کی منصوبہ بندی کرتے ہیں اور وہ خود انسانوں کے قتل میں شریک ہوتے ہیں اور اس طرح کے واقعات سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اور اس کے بعد وہ محض بیان بازی پر اکتفا کرتے ہیں، اور عملی طور پر کوئی قدم نہیں اٹھاتے، حالانکہ وہ اتنی قوت کے مالک ہوتے ہیں کہ اگر ذرا سنجیدہ ہوجائیں تو یہ خود بخود رک جائیں، اور بعض لوگوں کے اندر شعور کے فقدان کا یہ عالم ہوتا ہے کہ وہ یکسر خاموشی اختیار کرلیتے ہیں اور ان پر کبھی اپنی ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کرتے، آج ظالم ومظلوم کا فرق صرف ختم نہیں ہوگیا ہے؛ بلکہ دونوں کی تعریف بدل گئی، ظالم مظلوم بن گیا ہے، دنیا کے عظیم ممالک جو اپنے مادی وسائل اور فوجی طاقت کے بل بوتے پر دنیا میں اپنی ہیبت قائم کرتے ہیں وہ ایسے دوگروہوں کے جھگڑوں کے حل کرنے سے عاجز ہیں جو معمولی ساز وسامان اور معمولی پیسوں کے بھی مالک نہیں اور زندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ان کے پاس سرمایہ بھی نہیں ہوتا جس کے نتیجہ میں مسلسل جنگ جاری رہتی ہے جو زبردست جانی ومالی نقصان کا سبب بنتی ہے اور سیکڑوں پریشاں حال اپنے وطن سے ہجرت کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اور دنیا کی سپر پاور طاقتیں ان رسوا کن اور تکلیف دہ مناظر کا بس مشاہدہ کرتی رہتی ہیں جب کہ ان کے پاس ساز وسامان اور طاقت وقوت کی فراوانی ہے جن کے بل بوتے پر وہ ان مسائل کا خاتمہ کرسکتے ہیں۔ لیکن ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ وہ انسانی شعور سے محروم ہیں۔

یہ انسانی احساس وشعور اور انسانی بیداری کا مسئلہ ہے جس کو موجودہ انسان نے بالائے طاق رکھ دیا ہے اس لئے کہ وہ مادی فلسفوں پر یقین رکھتا ہے اور وہ شعور کے اثر کا منکر ہے، بلکہ وہ

شر انگیز فلسفوں، لوٹ مار، قتل وغارت گری اور ذاتی نفع پر یقین رکھتا ہے اور اسی کے اندر اپنی بھلائی اور بہتری تصور کرتا ہے، اس کے نزدیک شرافت، ایثار وقربانی، مواسات وغم خواری، نفاق، پسماندگی اور بنیاد پرستی کی دلیل ہیں، جس کا موجودہ مادی دور میں کوئی مقام ومرتبہ نہیں۔

آج دنیا کی مشکلات اور اس کے مسائل بڑے پیچیدہ اور سنگین ہیں اور اس انسانی شعور اور بیداری کے فقدان کی بنا پر وہ خطرناک رخ پر جارہے ہیں، یقیناً انسان نے ایسے وسائل ایجاد کرلیے ہیں جن کے ذریعہ وہ پوری دنیا سے باخبر ہوسکتا ہے اور پوری دنیا کو اپنی نگاہوں کی گرفت میں لے سکتا ہے، لیکن اس کے اندر سے قلبی شعور اور بصیرت ختم ہوچکی ہے، چنانچہ وہ اپنی خلقت، لباس اور رہائش کے طرز کی وجہ سے بظاہر انسان ہے، لیکن وہ اپنے خیالات ومیلانات اور طبیعت ورجحان کے اعتبار سے وحشی ہے، یہ محض اس بنا پر ہے کہ اس نے خدا کی ہدایت وروشنی اور اخلاقی تربیت کو گنوادیا ہے، جس کے نتیجہ میں وہ اپنی سائنسی ایجادات اور تکنیکی وسائل وذرائع کے باوجود دنیا کو جہنم بنائے ہوئے ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولَئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ۔ (انعام۔۱۷۹)

''ان کے دل ہیں لیکن ان سے سمجھتے نہیں۔ اور ان کی آنکھیں ہیں مگر ان سے دیکھتے نہیں، اور ان کے کان ہیں پر ان سے سنتے نہیں۔ یہ لوگ (بالکل) جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی بھٹکے ہوئے ہیں۔ یہی وہ ہیں جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔''

انسانی سوسائٹی کو منجدھار سے نکالنے اور فلاح وکامرانی سے ہمکنار کرنے کے لئے جذبۂ تعاون وہمدردی، ایثار وقربانی، عفو ودرگذر اور حلم وبردباری کو فروغ دینا از حد ضروری ہے اور یہ سب چیزیں انسانی شعور اور انسانی اخوت کے فہم کے بغیر ایک ناتمام خواب کے مثل ہیں، جس میں اپنے بھائی کی تکلیف سے دوسرا رنجور ہو اور اس کی خوشی سے دوسرے کو سرور ہو، یہی معاشرت آج کی ضرورت ہے جو موجودہ تہذیب میں نایاب ہے۔

نام نہاد تہذیب میں انسان کی بے بسی

آج انسان مصائب وآفات کے بھنور میں گھرا ہوا ہے، خواہ وہ کسی بھی تہذیب سے تعلق رکھتا ہو، بہر حال اس کی زندگی پریشانیوں اور آزمائشوں سے دوچار ہے، اور ''انسانی آزمائش'' عصر حاضر کا سب سے بڑا المیہ نظر آتی ہے، آج کا نام نہاد مہذب انسان کتنے ہی بلند وبانگ دعویٰ کرے کہ اس نے سائنس وٹکنالوجی کے میدان میں حیرت انگیز کارنامے انجام دیئے ہیں، ستاروں پر کمندیں ڈالی ہیں اور وہ کام کر لیے ہیں جو پچھلے انسانوں کے وہم وگمان میں بھی نہیں آسکتے تھے، اس نے طرح طرح کی مشینیں ایجاد کر لی ہیں جن کے ذریعہ زندگی کو بہتر سے بہتر بنایا جاسکتا ہے، آنے والے خطرات کو پہلے سے معلوم کیا جاسکتا ہے، لیکن ان سب کے باوجود یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کی حالت پچھلے دور کے انسانوں سے کہیں بدتر ہے۔

آج کے دور میں انسان سے جو سب سے بڑی دولت چھن گئی ہے، وہ ہے راحت واطمینان اور دل کا سکون وقرار، کل لوگ اپنی زبوں حالی وغریبی میں بھی چین کی بانسری بجایا کرتے تھے، لیکن آج راحت کے ان تمام وسائل کے باوجود وہ پریشان وحیران ہیں حتی کہ آج وہ کم سن اور معصوم بچے بھی ذہنی وجذباتی تناؤ کا شکار ہیں جو کہ کل اس کا نام بھی نہیں جانتے تھے، اگر ان کے کسی عزیز رشتہ دار کا انتقال ہو جاتا اور تمام لوگ ماتم کناں ہوتے تب بھی وہ خوش وخرم کھیلتے پھرتے تھے، لیکن آج کا بچہ اسی طرح پریشان ہے جس طرح بوڑھا اور جوان ہے۔

دوسری چیز جو آج کے انسان کی زندگی میں مفقود ہے وہ امن وامان ہے، قدیم دور میں انسان پر امن زندگی گزارتا تھا اس کو اپنی ذات، اہل وعیال اور زمین وجائداد کے

بارے میں کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا تھا خواہ وہ کسی جنگل میں جھونپڑی بنا کر رہتا ہو، لیکن آج بڑی بڑی کوٹھیوں اور حویلیوں میں لوگوں کو سکون میسر نہیں، نگہداشت میں رہنے کے باوجود دل مطمئن نہیں، جان کا ہر وقت خطرہ، زندگی کے بارے میں طرح طرح کے اندیشے اور اس سے بڑھ کر افسوس کی بات تو یہ ہے کہ آج انسان اپنے عقیدہ و دین کو بھی محفوظ نہیں سمجھتا، اس کو اپنی مرضی سے طرز زندگی اختیار کرنے کی آزادی نہیں ہے ایک عقیدہ کے ماننے والوں پر مخالف عقیدہ زور زبردستی سے تھوپا جارہا ہے، امن وآشتی کے زمانے میں لوگ بادشاہوں وامراء کے زیر سایہ اپنی پسند اور مرضی کی زندگی گزارتے تھے، اپنے دین پر عمل کرتے تھے جس کو تہذیب حاضر کے علمبردار ظلم وزیادتی اور غلامی کا دور بتلاتے ہیں وہ دور بھی آج سے اچھا تھا اور اس میں بھی وہ آزادی نہیں چھینی گئی اور وہ ظلم وزیادتی نہیں کی گئی جو آج کی جارہی ہے۔

آج مہذب انسان نے کیا ترقی کی؟ علم ودانش نے زندگی کو کیا دیا؟ کیا آج جنگیں نہیں ہورہی ہیں، ظلم وجور اور جبر واستبداد کی گرم بازاری نہیں ہے؟ انسانی جانوں کو ادنیٰ مفاد کی خاطر ضائع نہیں کیا جارہا ہے؟ اور کیا آج محرومی وشقاوت کی عجیب شکلیں نہیں دیکھی جارہی ہیں، حوادث وآفات پیش نہیں آرہے ہیں؟ اگر کوئی عقل مند ان سوالات پر ٹھنڈے دل سے غور کرے تو وہ اس حقیقت کا اقرار کرنے میں کوئی تامل نہیں کرے گا کہ انسان عاجز محض اور مجبور وبے بس ہے، اللہ تعالیٰ ہی قادر مطلق اور عالم الغیب والشہادہ ہے، اگر اس کی ذات پر ایمان ویقین اور توکل واعتماد سے محروم ہے تو یہ انسان بے حیثیت ہے، اللہ کی قدرت کو کوئی چیلنج نہیں کرسکتا اسی کا فیصلہ آخری فیصلہ ہے "لا معقب لحکمہ"۔

آئے دن کے حادثات وواقعات انسانوں کے سامنے اس کے دلائل وبراہین پیش کرتے رہتے ہیں، چنانچہ "کیٹرینا" سے جو تباہی وبربادی ہوئی اور جس تیزی سے اس نے علاقے کے علاقے صاف کردیئے وہ سب کے سامنے ہے، اور یہ اس ملک میں ہوا جو اپنے

آپ کو ''آقائے عالم'' تصور کرتا ہے، تہذیب کا علمبردار ہے، علم وہنر پر جس کو ناز ہے، پھر ''ریٹا'' نامی دوسرا طوفان آیا، چند برسوں پہلے ہندوپاک میں ایک زبردست بھونچال آیا جس میں ہزاروں لاکھوں کی جانیں ضائع ہوگئیں، اس سے پہلے ''سونامی'' لہر میں نصف ملین سے زیادہ لوگ تباہ ہوگئے جس کی یہ توجیہ کی گئی تھی کہ وہ تحفظاتی ودفاعی نظام کے فیل ہوجانے کی وجہ سے پیش آیا تھا اور اس کا علم پہلے نہ ہوسکا ورنہ اس پر قابو پالیا جاتا لیکن سوال یہ ہے کہ کسی پسماندہ ملک میں ایسا ہوتو کوئی زیادہ حیرت وتعجب کی بات نہیں؛ لیکن جو تحفظ ودفاعی مشینری اور ٹکنالوجی اور طاقت وقوت میں اپنے آپ کو سب سے فائق مانتا ہے وہ کیونکر اپنا تحفظ ودفاع نہ کرسکا؟۔

نام نہاد تہذیب وتمدن کے علمبردار اور حقوق انسانی کے پاسبان ایک طرف تو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کے پاس تمام مسائل کا حل موجود ہے، اور امن وسلامتی کے تمام ذرائع مہیا ہیں، وہ انسانی حقوق کے محافظ ہیں، باہمی گفت وشنید سے مسائل حل کیے جاتے ہیں، کوئی ملک کسی ملک پر ظلم نہیں کرسکتا، اس کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کرسکتا، باہمی تعاون وتبادلہ اس دور کا امتیاز ہے، لیکن جب ایک طاقتور ملک دوسرے کمزور ملکوں پر حملہ کرتا ہے اور ان کو کمزور کرکے پوری طرح اپنے شکنجہ میں کس لیتا ہے اس وقت یہ تمام دعوے کہاں چلے جاتے ہیں؟ اقوام متحدہ بھی خاموش تماشائی بنی رہتی ہے، آج کل ایک دعوی یہ بھی کیا جاتا ہے کہ موجودہ ترقی یافتہ دنیا قیدیوں کو حقوق عطا کرتی ہے اور ان کا پورا احترام قائم رکھتی ہے، لیکن ترقی یافتہ ممالک کی جیلوں میں بند بے چارے قیدی جن سختیوں کا سامنا کررہے ہیں وہ صرف ظالمانہ نہیں، بلکہ وحشیانہ ہیں، درندوں سے تو اس طرح کا برتاؤ کا تصور کیا جاسکتا ہے، انسانوں سے نہیں۔

پہلے جنگیں محدود پیمانے پر ہوتی تھیں اور ان کے نقصانات بھی بہت محدود ہوتے تھے، لیکن آج جنگیں عالمی پیمانہ پر ہوتی ہیں جن میں وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے اسلحے استعمال کیے جاتے ہیں، دہشت گرد تنظیموں اور تحریکوں کو مدد دی جاتی ہے کہ وہ معصوم جانوں پر ظلم

کے پہاڑ توڑیں، گھروں میں سونے والے، سڑکوں پر چلنے والے بے گناہوں پر بم برسائیں، لیکن پھر بھی دعویٰ یہ ہے کہ آج کا دور تہذیب اور امن کا ہے، اور عزت وناموس کے تحفظ کا ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ''نیچر'' ہی خدا ہے اور انسان خود اپنا خدا ہے وہ جو چاہے کرسکتا ہے، ان کے قبضہ وقدرت میں ہر چیز ہے اکثر اہل اقتدار اسی منطق کی طرف مائل ہیں اور اس پر ان کا عمل ہے، بعض اطباء نے جب ''کلوننگ'' (ہمزاد بنانے میں) کامیابی حاصل کی، تو وہ سمجھے کہ وہ خود خدا ہیں۔

ان اہل طاقت وقوت اور سائنس دانوں کے یہ تصورات ونظریات دین اور اہل دین کے سامنے ایک چیلنج بن کر سامنے آئے، لیکن جلد ہی خالق ارض وسما کی قدرت وحکمت سے پیش آنے والے واقعات وحادثات نے ان کے ان دعووں کو طفلانہ خیال ثابت کردیا، اور دنیا کے سامنے ثابت ہوگیا کہ ان جھوٹے خداؤں کی مثال وہی ہے جس کو قرآن اس طرح بیان فرماتا ہے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِي حَاجَّ إِبْرَاهِيمَ فِي رَبِّهِ أَنْ آتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ قَالَ أَنَا أُحْيِي وَأُمِيتُ قَالَ إِبْرَاهِيمُ فَإِنَّ اللَّهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ۔

کیا تم نے نہیں دیکھا اس شخص کو جس نے ابراہیم (علیہ السلام) سے جھگڑا کیا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو بادشاہت دی تھی، جب ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ میرا رب وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے، وہ کہنے لگا میں بھی زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں (اور اس نے ایک شخص کو معاف کردیا اور دوسرے کو قتل کردیا) ابراہیم علیہ السلام نے کہا: کہ اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو تم مغرب سے نکال دو، تو وہ کافر مبہوت ولاجواب ہوگیا اور اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔

قرآن کریم نے اس طرح کے متکبرین وسرکشوں کے واقعات بیان فرمائے ہیں

تا کہ عبرت حاصل کرنے والے عبرت لیں، سورہ قلم میں باغ والوں کا واقعہ بیان فرمایا کہ انھوں نے بڑے تکبر سے کہا کہ کل ہم صبح صبح باغ کو کاٹ لیں گے اور وہ اللہ کو بالکل بھول گئے خود کو قادر سمجھتے ہوئے گئے اور سرگوشی کرنے لگے کہ دیکھو اندھیرے اندھیرے میں کاٹ لو اور کوئی مسکین یتیم نہ آنے پائے، ادھر پہلے سے اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہو گیا تھا اور کھیت بالکل اس طرح صاف ہو گیا کہ جیسے کاٹ دیا گیا ہو، انھوں نے جب اس کو دیکھا تو بولے شاید بھٹک کر دوسری جگہ آ گئے ہیں لیکن جب غور کیا تو حقیقت سمجھ میں آ گئی اور کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب آ گیا ہے اور ہم محروم ہو گئے ہیں، اور پھر پچھتائے اور چارو ناچار اللہ کی طرف رجوع ہوئے اور بولے "سبحان ربنا انا کنا ظالمین"۔

بالکل بعینہٖ یہی حال آج کے انا ربکم الاعلیٰ کہنے والے متکبرین کا ہے، قرآن مجید آج ان کو یہ دعوت دیتا ہے کہ دیکھو تکبر سے باز آ جاؤ ورنہ تمہارا انجام برا ہوگا، مسلسل رونما ہونے والے حادثات سے عبرت حاصل کرو اور ایک اللہ کی ذات پر ایمان لے آؤ، وہی مالک حقیقی ہے وہ اپنی ذات وصفات میں لاشریک ہے اپنے ارادے میں اور تدبیر میں مختار ہے، پوری کائنات اسی کے حکم کے ماتحت ہے وہ جو چاہے اور جب چاہے کر سکتا ہے "إنما أمره اذا أراد شيئاً ان يقول له كن فيكون" اس کا معاملہ تو یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کو کرنا چاہتا ہے تو اس سے کہتا ہے ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے" آج اسی حقیقت کو سمجھنے اور سمجھانے اور اس کے مطابق عبدیت و بندگی کی زندگی گزارنے اور اس کی دعوت دینے کی ضرورت ہے۔

متمدن انسان غیر متمدن انسانیت

عصر حاضر میں انسانی آزادی کا نعرہ یورپی ممالک سے بڑی قوت وشدت کے ساتھ بلند کیا گیا۔ شخصی آزادی اور شہریت کے مساویانہ حقوق کے سلسلہ میں متعدد عالمی معاہدے بھی ہوئے؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اکثر ممالک میں قومیت، ثقافت، دین اور سیاسی واقتصادی فکر کی بنیاد پر تفریق وامتیاز کا سلسلہ اب بھی جاری ہے، بلکہ اس میں شدت پیدا ہوگئی ہے۔ آزادی سلب کرنے کے لیے سخت ترین ذرائع استعمال کیے جاتے ہیں اور حکمراں طبقہ کے نظریہ اور سیاست سے اختلاف کرنے والوں کو اذیت ناک تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اس سے کوئی ملک مستثنیٰ نہیں۔

موجودہ دور میں انسان کی نظریاتی، فکری اور قانونی پیش رفت کے متعلق جو بھی کہا جائے، لیکن حقیقت میں انسان عہد ماضی کی طرح اب بھی دباؤ اور گھٹن کے ماحول میں زندگی گذار رہا ہے، اگر کوئی روئے زمین پر کسی ایسے حصہ کو تلاش کرے جہاں وہ مکمل آزادی کے ساتھ عزت وشرف کی زندگی گزار سکے، اس پر کسی کا دباؤ نہ ہو، جبر وتشدد کا اسے سامنا نہ ہو، اظہار خیال کی اسے پوری آزادی ہو، تو اس کو ایک شاعرانہ تصور کے علاوہ کچھ نہیں کہا جاسکتا، اس وقت دنیا کے مختلف ممالک کے ہزاروں؛ بلکہ لاکھوں شہری اسی آزادی کی تلاش میں دوسرے ملکوں میں زندگی گزار رہے ہیں، جو اپنے ملک کے حکام کے نظریہ سے اختلاف کرنے کی وجہ سے ملک چھوڑنے پر مجبور ہوئے، سیاسی جبر وقہر کی عمومیت کی وجہ سے اس دور میں ایسی تنظیمیں وجود میں آگئی ہیں جو ذہن سازی یا جبر وقہر کا کام انجام دیتی ہیں اور وہ سخت

ترین عذاب اور عبرتناک سزا دینے کی ٹریننگ دیتی ہیں یہی نہیں بلکہ انسانوں کو عذاب دینے کے لئے متعدد آلات اور مشینیں ایجاد کرلی گئی ہیں، جن کا استعمال اصلی مجرموں، قاتلوں اور رہزنوں کی سزا کے لئے نہیں ہوتا؛ بلکہ مخالف سیاسی قائدین، مفکرین، علما، سن رسیدہ لوگوں حتی کہ بچوں کی سزا کے لئے ہوتا ہے اسی طرح چھوٹے بچوں کے ذہنوں کو بدلنے اور ان کو اپنے ماحول اور سماج سے باغی بنانے کے لئے بھی یہ وسائل استعمال کیے جاتے ہیں۔

زمانۂ جاہلیت میں عرب کے کسی حکمراں نے کچھ لوگوں کو زندہ جلا دیا تھا، اس کی وجہ سے ہمیشہ کے لئے اس کے نام کے ساتھ ''محرق'' یعنی جلانے والے کے لقب کا اضافہ ہوگیا، کہا جاتا ہے کہ عرب کی پوری تاریخ میں (باختلاف روایات) دو ایسے حکمراں گزرے ہیں جنھوں نے زندہ جلا دینے کی سزائیں دیں، لیکن اب زندوں کا جلایا جانا کوئی اچنبھے کی بات نہیں رہ گئی یہ اب معمولی سا واقعہ بن گیا ہے جس کی مہذب سماج میں کوئی اہمیت نہیں، آج انسان آئے دن اخبارات میں پڑھتا رہتا ہے کہ ''فلاں گروہ کے اتنے لوگ جلا دیے گئے ان میں عورتیں اور بچے بھی تھے'' لیکن اس خبر سے کسی میں حرکت پیدا نہیں ہوتی، جب کہ یہ واقعات کسی غیر معروف یا دور دراز علاقوں میں نہیں بلکہ ایسے مشہور اور ترقی یافتہ شہروں میں پیش آتے ہیں جن سے ہر شخص واقف ہوتا ہے، گذشتہ زمانے میں اگر کوئی کسی کو گالی دیتا یا کسی کے متعلق نامناسب کلمات کہہ دیتا تو وہ ''زبان دراز''، بدکلام، فحش گو یا ہجو گو' جیسے القاب سے مشہور ہوجاتا تھا لیکن اس زمانے میں انفرادی طور پر ہی نہیں اجتماعی طور پر گالی دینے اور فحش کلامی کی غرض سے باقاعدہ جلوس نکالے جاتے ہیں، انھیں مکمل آزادی حاصل ہوتی ہے اور اس کو ''شخصی آزادی'' اور ''اظہار خیال کی آزادی'' تصور کیا جاتا ہے اور ایسی کتابیں لکھی جاتی ہیں جن میں قابل احترام شخصیتوں اور تاریخی شہرت کے حامل افراد کو نشانہ بنایا جاتا ہے، حتی خالص مذہبی شخصیتیں بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔

پہلے شجاعت و بہادری اس کا نام تھا کہ کوئی اپنے سے قوی تر اور مسلح شخص سے

مقابلہ کرے، تنہا اور نہتے شخص پر حملہ کرنا بزدلی سمجھا جاتا تھا، لیکن انقلاب زمانہ کی ستم ظریفی دیکھئے! بے خبری میں اچانک حملہ کرنے کے لئے مختلف طریقے اپنائے جاتے ہیں اور اس کو دانش مندی، ذہانت اور ہوشیاری سے تعبیر کیا جاتا ہے، لہٰذا سوتوں پر، سواروں پر، عورتوں اور بچوں پر، مسافروں پر، جلسوں میں شرکت کرنے والوں پر اور عبادت گاہوں میں عبادت میں مشغول لوگوں پر ظلم کیا جاتا ہے اور ظالم اپنی اس گھٹیا حرکت پر پشیماں ہونے کے بجائے فخر کرتا ہے۔

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد

یہ سچ ہے کہ انسان اپنے کلام، لباس، گھر، دفتر اور سواری کے انتخاب میں تو مہذب ہو گیا اور ترقی کر گیا، لیکن اسی کے ساتھ اپنے اخلاق وسلوک اور انسانی قدروں کو اس نے قربان کر دیا ہے، اب چاہے جتنی کوششیں صرف کی جائیں، جتنی ہی تقریریں ہوں، کتنی ہی کانفرنسیں منعقد ہوں، برسوں معاہدے کیے جائیں اور قوانین وضع کیے جائیں۔ سب بے سود، اس لیے کہ بہتر سے بہتر معاہدے کیے جا چکے ہیں؛ لیکن صرف کاغذ پر۔

پسماندہ ممالک کی بات ہی نہیں؛ ترقی یافتہ یورپی ممالک میں زندگی غیر محفوظ ہو کر رہ گئی ہے۔ حتی کہ امریکہ میں بھی ہر شخص ہر گھڑی اور ہر آن، اپنی جان کا خطرہ محسوس کرتا ہے۔ قتل کی وارداتیں ہوتی رہتی ہیں، انفرادی واجتماعی مظالم شباب پر ہیں، تجارتی منڈیوں میں ڈاکہ زنی عام ہے اور ان جرائم کا تناسب گھٹنے کے بجائے بڑھتا ہی جا رہا ہے، بعض دانشوروں نے ان جرائم کی زیادتی کی وجہ نفسیاتی دباؤ کو قرار دیا ہے، اور یہ تجویز پیش کی کہ ''انسانوں پر سے ہر قسم کی بندشیں اور پابندیاں اٹھالی جائیں اور انھیں نفسیاتی دباؤ سے مکمل آزادی دے دی جائے'' تو شائد ذہن کو کچھ سکون مل جائے، لیکن ان قیود کے ہٹنے سے نفسیاتی دباؤ میں اور اضافہ ہو گیا، ان ترقی یافتہ ممالک میں خودکشی کا تناسب آسمان کو چھو رہا ہے، یورپی سوسائٹی میں نفسیاتی دباؤ سے نیند کی گولیاں اور نشہ آور دواؤں کا استعمال عام ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ آج انسان نے بہت سی بیماریوں پر قابو پالیا ہے لیکن اس کی خود سر سیاست، دوسروں پر غلبہ کی ہوس، اور اس کی بے راہ روی نے نئی نئی لاعلاج بیماریاں پیدا کردی ہیں جن کے سمجھنے اور جن پر قابو پانے سے اطباء بھی عاجز نظر آتے ہیں۔

جرم کے پہچاننے، سچ اور جھوٹ میں تمیز کرنے، بلکہ دل کی دھڑکنوں تک کا پتہ لگانے کے لیے مشینیں تو ایجاد کرلی گئیں؛ لیکن انسان اپنی فراست، ذہانت اور عقل مندی کھو بیٹھا، اور اپنی فطری صلاحیتوں اور طبعی خصوصیات سے محروم ہوتا جارہا ہے۔

عہد ماضی میں علم کا تناسب بہت کم تھا اس لیے سمجھا یہ جاتا تھا کہ جہالت و نادانی کی وجہ سے انسان حادثات سے دوچار ہوتا ہے، لیکن جوں جوں علم بڑھتا گیا انسان کی ہلاکت و بربادی کی نئی نئی شکلیں سامنے آتی گئیں اور حوادث کا گراف بڑھتا گیا، اب صورت حال یہ ہوگئی ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ سے ہی انسان اور اس کی زندگی کو خطرہ لاحق ہے، اس لیے کہ جن کے ہاتھوں میں علم کا پرچم ہے اور جو سیاہ و سپید کے مالک بنے ہوئے ہیں، وہی لوگ زمین میں فساد مچاتے پھرتے ہیں اور تخریب کے نئے میدان تلاش کرتے نظر آتے ہیں۔

مغربی طرز زندگی

انسانی قدروں کے لیے ایک عظیم خطرہ

امریکہ میں ہونے والے خودکشی کے واقعات کی تازہ رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں ہر سال بیس ہزار سے زیادہ افراد دماغی الجھن، ذہنی انتشار اور زندگی کی ناکامیوں سے عاجز ہو کر خودکشی کا ارتکاب کرتے ہیں۔

ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ انہیں معاشروں میں خودکشی کے واقعات زیادہ رونما ہوتے ہیں جہاں انسان اپنے سے نیچے والے کو نہیں اوپر والے کو دیکھتا ہے، جہاں وہ اپنی ہر خواہش کو پورا کرنا چاہتا ہے، دوسرے پر سبقت لے جانے کا خیال ہر وقت اس پر مسلط رہتا ہے اور اس کو سکون سے جینے نہیں دیتا، یہی وجہ ہے کہ مغربی ممالک میں یہ واقعات زیادہ ہوتے ہیں جب کہ مشرقی ممالک میں یہ واقعات کم ہوتے ہیں۔

خودکشی ہمیشہ ذہنی انتشار، عملی زندگی میں ناکامی، احساس کمتری اور مایوسی کا نتیجہ ہوتی ہے اور ان احساسات کے حامل افراد کے اندر قوت ارادی باقی نہیں رہتی کہ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے کوئی نئی جدوجہد کر سکیں، اسی لیے جہاں خودکشی کے واقعات ہوتے ہیں وہاں دوسرے اخلاقی اور اجتماعی جرائم بھی زیادہ ہوتے ہیں، جو لوگ زندگی یا اپنی صلاحیت سے مایوس نہیں ہوتے وہ اپنی روا و ناروا خواہشات کو پورا کرنے کی نت نئی راہیں ڈھونڈھتے ہیں اور دوسرے انسانوں کے حقوق چھین لینے میں وہ ذرہ برابر جھجک محسوس نہیں کرتے۔ نتیجہ

یہ ہوتا ہے کہ پورا معاشرہ اخلاقی اور اجتماعی جرائم کا اڈہ بن جاتا ہے۔

ترقی یافتہ اور متمدن ممالک کی اجتماعی اور معاشرتی زندگی اگرچہ زیب وزینت کے سامان، تراش وخراش اور عیش وعشرت کے ذرائع سے مالا مال ہے؛ لیکن چین وسکون کی دنیا سے کوسوں دور ہے۔ وہاں کے باشندے ایک طرح کی گھٹن اور ذہنی کشمکش کے شکار ہیں۔ وہ اعصابی توازن کھو چکے ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ کثرت کے ساتھ ذہنی اور اعصابی امراض سے دوچار ہیں اور اس گھٹن سے نکلنے کے لیے اکثر خودکشی کا سہارا لیتے ہیں، اس کے علاوہ اخلاقی جرائم، قتل وغارت گری اور دہشت پسندی کے روز افزوں واقعات کا تو ذکر ہی کیا۔

تاریخ عالم اور خصوصاً ریاستہائے متحدہ امریکہ کی تاریخ کا ایک سرسری جائزہ اس معاشرہ میں رہنے والے انسانوں کی ذہنیت پر پوری طرح روشنی ڈالتا ہے۔ وہاں اس طرح کے واقعات اس کثرت سے پیش آتے ہیں کہ ماہرین سماجیات انگشت بدنداں ہیں؛ لیکن اس کا کوئی مناسب حل ابھی تک تلاش نہیں کر سکے ہیں۔ اس مسئلہ کا واحد حل سوسائٹی میں بنیادی طور پر فکری اور اجتماعی انقلاب ہے۔ ایک رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ میں ہر سال ایک لاکھ قتل کی وارداتیں پیش آتی ہیں۔ جنسی بے راہ روی کے واقعات کی تعداد تقریباً پانچ لاکھ ہے، اور لگ بھگ چار لاکھ افراد دہشت پسندی اور انارکی جیسے جرم کے شریک نظر آتے ہیں۔ مرد وعورت کے باہمی اختلاط نے غیر قانونی شرح پیدائش میں اس قدر اضافہ کر دیا ہے کہ ہر سال دس لاکھ امریکی لڑکیاں حاملہ ہو جاتی ہیں۔

اس اخلاقی گراوٹ کے واقعات ان ممالک میں بھی رونما ہو رہے ہیں جن پر امریکی طرز حیات نے اپنے گہرے نقوش چھوڑے ہیں، حتی کہ بعض اسلامی ممالک جو اسلامی اقدار وروایات کا دم بھرتے ہیں وہ بھی اس مہلک اثر سے محفوظ نہ رہ سکے، چنانچہ سعودی عرب کی زندگی جو مسلم ملکوں میں سب سے زیادہ اخلاقی اور اجتماعی پابندیوں پر عمل کرنے والا ملک ہے مغربی مشینری اور اس کی تہذیب وثقافت سے متاثر ہو رہی ہے۔

اخبارات میں ایسی رپورٹیں وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہتی ہیں جن میں دنیا میں پیش آمدہ مختلف طرح کے واقعات کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے، لیکن ان کی اشاعت اخباروں تک محدود رہتی ہے۔ عام طور پر لوگ ان پر سرسری نگاہ ڈال کر گذر جاتے ہیں اور ان سے وہ دوررس نتائج نہیں نکالتے جو ان کی سلوٹوں میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ وہ نتائج زندگی کے اسی تصور سے ٹکراتے ہیں جو ترقی یافتہ معاشرے کے متعلق مغربی مفکرین نے ذہنوں پر مسلط کر دیا ہے۔ اسی وجہ سے اگر کوئی بات اس روایتی نقطۂ نظر سے ہٹتی ہے تو اس سے صرف نظر کر لیا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے مغربی طرز زندگی کے خدوخال اپنی شکل میں نمایاں ہو کر ہمارے سامنے نہیں آتے، اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ عالمی خبر رساں ایجنسیاں اور ریڈیو صرف ان واقعات کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں جن کا تعلق مشرقی یا پس ماندہ ممالک سے ہوتا ہے، اور وہ ترقی یافتہ ممالک کی سیاسی آمریت، فکری انتشار، جماعتی کش مکش اور اخلاقی انارکی پر کوئی توجہ نہیں دیتے۔

یہ سب مغرب کی خوفزدہ ذہنیت کا نتیجہ ہے۔ وہ اب تک اپنی ذات پر اعتماد قائم نہیں کر سکا ہے۔ اسی لئے وہ مشرق سے پیہم برسرپیکار ہے۔ مشرق کے پاس ترقی کے تمام امکانات موجود ہیں، وہ آج بھی اپنی گذشتہ عزت و وقار واپس لا سکتا ہے۔ خصوصاً شرق اسلامی جس کو مغرب اپنے لیے سب سے بڑا خطرہ سمجھتا ہے اس اقدام کی سب سے زیادہ صلاحیت رکھتا ہے۔

لیکن مغرب وہاں ایمان و یقین اور جوش و جذبہ کے تمام شراروں کو سرد کرنے کے درپے ہے، وہ اس کے عیوب ظاہر کرنے کے لیے اپنے تمام وسائل استعمال کر رہا ہے۔ لیکن حقائق، حقائق ہوتے ہیں، ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی اور وہ وقت دور نہیں کہ ہر صاحب بصیرت کے سامنے یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی جس پر مغربی آمریت نے جھوٹے وعدوں کی ایک دبیز چادر ڈال رکھی ہے۔ اور وہ وہ وقت ہوگا جب عالم اسلام مغرب کی سیاسی بازی گری کے جال سے نکل چکا ہوگا اور اپنے ذہین افراد کے بل بوتے پر اپنے مستقبل کی تعمیر میں رواں دواں ہوگا۔

مذہب اور اخلاق کے بغیر؟

مذہب سرکشوں کو سرکشی سے، ظالموں کو ظلم سے اور مجرموں کو ارتکاب جرم سے باز رکھنے کی قوت رکھتا ہے، کیونکہ کہ وہ آسمانی تعلیمات پر مبنی ہوتا ہے اس میں انسانی زندگی گذارنے اور دوسرے انسانوں کے ساتھ سلوک کرنے کے اصول وضوابط ہوتے ہیں، مذہب انسان میں ایک ایسی داخلی قوت تمیز پیدا کردیتا ہے کہ وہ اچھے اور برے کو پہچاننے لگتا ہے اور خدا کے یہاں جواب دہی کا تصور اتنا مستحکم ہوجاتا ہے کہ اس خیال ہی سے وہ خود بخود برائی سے رک جاتا ہے، مذہب انسان کو اس کے فرائض اور ذمہ داریوں سے آگاہ کرتا ہے اور اس کے دل میں نفع وضرر اور سود وزیاں کا احساس پیدا کرتا ہے اور یہ خوف پیدا کرتا ہے کہ اس کے ہر عمل کو ترازو میں تولا جارہا ہے اور کسوٹی پر پرکھا جارہا ہے اور وہ اس کے لیے جوابدہ ہے، یہ احساس نہایت گہرا اور ہمہ گیر ہوتا ہے جس کا دائرہ اثر دنیا کی اس دوروزہ زندگی ہی تک محدود نہیں رہتا بلکہ اس عالم فانی کے بعد ابدی زندگی میں نفع وضرر کا یہ احساس پوری قوت کے ساتھ ذہن ودماغ پر چھایا رہتا ہے، مذہبی تعلیمات ہی کی روشنی میں انسان خیر وشر کے درمیان تمیز کرتا ہے، مذہب ہی کے ذریعہ سے انسان کے دل میں محبت، الفت ومودت، ایثار وہمدردی، قناعت وخیر سگالی کے شریفانہ جذبات انگڑائیاں لیتے اور خدا کی جانب سے عطا ہونے والے بے پایاں اجر وثواب کی آس بندھاتے ہیں مذہب کیوجہ سے انسان کے اندر محاسبۂ نفس کا وہ تصور پیدا ہوتا ہے جو اسے زندگی کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے اور خواہشات نفسانی کے دام فریب میں گرفتار ہونے سے بچاتا ہے، چنانچہ جب کبھی برے خیالات،

شیطانی وسوسے اسے ارتکاب جرم پر آمادہ کرتے ہیں تو محاسبہ نفس کا یہی تصور سدّ آہن بن کر اس کی راہ میں کھڑا ہو جاتا ہے اسی پر بس نہیں، خلوت وجلوت میں یہی انسان کو کار خیر اور اچھے عمل کی تلقین کرتا ہے، یہی احساس رات کے اندھیرے میں یا تنہائی میں جہاں کوئی دیکھنے والا نہ ہو یا کوئی منع کرنے والا نہ ہو، اسے برائی سے روکتا ہے۔

صحت وقوت، دولت وثروت کی کثرت انسان کے اندر حرص وہوس، اور لالچ وطمع کے جذبات پیدا کرتی ہے، مالداروں کو ان کی دولت، عناد وسرکشی، کبر ونخوت، تکبر وخودسری کا شکار بناتی ہے، طاقت وقوت کے مالکوں میں سرکشی کا جذبہ پیدا کرتی ہے، علم اور عقل حاملین علم میں انانیت اور خودسری پیدا کرتی ہے، اگر اس طاقت وقوت، مال دولت اور علم وعقل کو کنٹرول کرنے اور ان میں توازن پیدا کرنے والی کوئی قوت نہ ہو، تو اس طاقت وقوت کے نشہ میں طاقتور کمزور ونا تواں انسان پر ظلم کرتا ہے، مال ودولت کے غرور میں مبتلا انسان غریب وبے آسرا لوگوں کی تحقیر وتذلیل کرتا ہے، علم میں گھمنڈ میں مبتلا کم علم رکھنے والوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے، یہ صلاحیتیں دوسروں کے حقوق سلب کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہیں، یہاں مذہب اپنا کام کرتا ہے، مذہب یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ ہر صلاحیت خدا کی دی ہوئی ہے اور اس کو اس کے حکم کے مطابق صرف کرنا چاہئے، وہ ان صلاحیتوں کو صحیح رخ پر ڈالتا ہے وہ صاحب حیثیت انسانوں سے ان کی طاقت وقوت سلب نہیں کرتا، وہ حقوق طے کرتا ہے، ان کے استعمال کی پوری آزادی دیتا ہے، وہ یہ نہیں چاہتا کہ طاقتوروں اور مالداروں کو اس دنیا کے اندر مکمل آزادی دے دی جائے کہ جس طرح چاہیں کمائیں اور جس طرح چاہیں خرچ کریں، نہ وہ طاقت کے حصول اور استعمال کو مطلق آزاد چھوڑتا ہے کہ وہ شتر بے مہار کی طرح ہو جائیں، جس پر چاہے ظلم کریں، جس کے چاہے حقوق سلب کریں، چوپایوں اور درندوں کے طریقہ سے زندگی بسر کرے، دولت جمع کر کے، لذتوں سے لطف اندوز ہوں، وہ جنگلی بھیڑیوں کی طرح قتل وغارت گری، لوٹ مار اور شر وفساد کا بازار گرم کریں۔

مذہب کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ خدائی قوانین کے مطابق انسانی زندگی کی تعمیر وتشکیل کا ایک ضابطہ مقرر کیا جائے، جس میں انسانی ضرورتوں کا لحاظ بھی ہو، انسانی مزاج کی رعایت بھی ہو، ایک دوسرے کے حقوق کی ادائیگی بھی ہو، اپنی ذمہ داریوں کا پورا احساس بھی ہو، خدا کی بارگاہ میں جواب دہی کا یقین بھی ہو، خدا کی رضا اور خوشنودی کا ہمہ وقت خیال بھی ہو، ہر جگہ ہر وقت دیکھے جانے کا پورا یقین بھی ہو، یہ وہ چیزیں ہیں جو انسانی زندگی کے گرد محرمات اور ممنوعات کا ایک دائرہ کھینچتا ہے، انسان کو ہلاکت وتباہی کی طرف لے جانے والے راستوں کی نشاندہی کرتا ہے اور اسے ان حدود کو پار کرنے سے منع کرتا ہے۔

مذہب کا بنیادی نقطۂ نظر ہی یہ ہے کہ تمام مخلوق ایک خدائی کنبہ ہے اور پورا انسانی معاشرہ ایک خاندان کی حیثیت رکھتا ہے اس خاندان کا ہر فرد دوسروں کا تعاون کرنے اور مشکلات میں اس کی مدد کرنے کا مکلّف ہے وہ اپنے پیروکاروں کو اس بات کی تلقین کرتا ہے کہ طاقتور اپنی طاقت کے ذریعہ، مالدار اپنی دولت کے ذریعہ اور صاحب علم وکمال اپنے علم وفضل کے ذریعہ سے ضعیف وناتواں، فقیر وبے آسرا جاہل وناخواندہ انسانوں کی مدد کرے، وہ جزا اور سزا کا ایک ایسا شعور پیدا کرتا ہے جو انسانوں کو اچھے عمل کی طرف مائل کرتا ہے اور برے عمل سے روکتا ہے۔

جس معاشرہ میں یہ نیک جذبات اور لائق ستائش احساسات جلوہ گر ہوں گے تو وہ معاشرہ اتحاد واتفاق، مساوات وہمدردی، غمخواری وغمگساری کی روح سے لبریز ایک مثالی معاشرہ ہوگا، وہاں نہ کسی کی حق تلفی ہوگی، اور نہ اختلاف رائے کی بنیاد پر خون خرابہ کی نوبت آئے گی، اگر کسی وجہ سے ناچاقیاں اور دوریاں پیدا بھی ہوئیں تو اس معاشرہ کے اہل خیر، روشن دماغ اور اصحاب فضل وکمال، مال ودولت طاقت وقوت اور علم وفضل کے ذریعہ بہت جلد ان مشکلات پر قابو پالیتا ہے، وہ ہر مسئلہ صلح وصفائی، عفو ودرگذر اور آپسی اتفاق سے حل کرنے کی دعوت دیتا ہے، اگر کوئی اس صلح سے سرکشی کرتا ہے، تب اس کے خلاف محدود طاقت کے استعمال کی اجازت دیتا ہے، اس میں خیر کی دعوت، اور شر کو روکنے کی دعوت دی گئی ہے، تاکہ

سماج میں خیر بڑھے اور شر کم ہو، لیکن جس معاشرہ سے دین و مذہب کی یہ بالادستی ختم ہو جاتی ہے اور یہ تمام اخلاقی بندشیں اٹھ جاتی ہیں تو اس معاشرہ کا رخ، شر و فساد، ہلاکت و تباہی اور برائیوں کی طرف ہو جاتا ہے پھر اس معاشرہ کے افراد کو نہ دینی اخلاقی تعلیمات کی کوئی پرواہ ہوتی ہے اور نہ ہی اخلاقی بندشوں کا کوئی پاس ولحاظ ہوتا ہے، بلکہ وہاں رفتہ رفتہ محرمات وممنوعات کے ارتکاب کو جائز ومباح خیال کیا جانے لگتا ہے، نتیجتاً اس معاشرہ میں نت نئے مسائل جنم لیتے ہیں اور طرح طرح کی مشکلات کا ظہور ہوتا ہے اگر کسی مسئلہ کا حل تلاش بھی کر لیا جاتا ہے تو وہ صرف عارضی اور وقتی ہی ثابت ہوتا ہے، بلکہ بسا اوقات وہ نئے مسائل پیدا کر دیتا ہے۔

اسلام کی آمد سے قبل انسانی معاشرہ کی کم وبیش یہی حالت تھی، ایک انسان دوسرے انسان کا دشمن اور اس کے خون کا پیاسا بنا ہوا تھا، کسی کا مال ومتاع اور عزت وآبرو محفوظ نہ تھی، طاقتور باہم دست وگریباں تھے، معصوم جانیں ظالموں اور باغیوں کی بھڑکائی ہوئی آگ کا ایندھن بن رہی تھیں۔

دنیا کی موجودہ صورت حال کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہی نتیجہ نکلے گا کہ تہذیب وتمدن کے وسائل اور عروج وارتقا کے اسباب کی فراہمی کے باوجود اس کی حالت زمانۂ جاہلیت سے مختلف نہیں، آج اسلام واسلامی تعلیمات نافذ کرنے والوں کے خلاف جو جنگ چھیڑی جا رہی ہے اس کے اثرات خود انسانیت کے حق میں ضرر رساں ثابت ہوں گے، اس لیے کہ اسلام ہی وہ دین ہے جو آج اپنی اصل شکل میں ہے، اور اس کی تعلیمات وہدایات آج بھی پوری طرح محفوظ ہیں، خیر وشر کو پرکھنے کے لیے اس کا معیار آج بھی معیار تسلیم کیا جاتا ہے۔

تہذیب وتمدن محض علوم وفنون اور چند مخصوص افکار ونظریات کا نام نہیں، تہذیب وتمدن کا اطلاق ایک مربوط نظام حیات اور جامع وہمہ گیر فلسفۂ زندگی پر ہوتا ہے جن کی بنیاد چند اصولوں پر ہوتی ہے، مہذب اور غیر مہذب کے درمیان فرق صرف یہی ہے کہ مہذب شخص کے پاس زندگی بسر کرنے کے اصول وضوابط اور ایک خاص ضابطہ حیات ہوتا ہے، جس کی روشنی

میں وہ اپنے مراحل زندگی طے کرتا ہے، رہا غیر مہذب تو وہ اس دستور حیات سے عاری اور ان اصول وقوانین سے محروم ہوتا ہے وہ خواہشات نفس کا غلام ہوتا ہے، موجودہ تمدن کا رجحان دین واخلاق سے آزاد ہونے کی دعوت پر قائم ہے اس سے انسان کے اندر نفسانی خواہشات، آوارگی اور بے حیائی کے جذبات ابھر سکتے ہیں اور ان میں مزید شدت پیدا ہوسکتی ہے۔

اس طرح موجودہ تمدن حیوانی زندگی کی شکل اختیار کرلے گا، اس تمدن کے قبول کرنے والے اور اس سے متاثر ہونے والوں کی زندگی، درندوں، بھیڑیوں اور جنگلی جانوروں سے ذرا بھی مختلف نہیں ہوگی، بلکہ ایک عربی شاعر کے مطابق انسان کا لباس تو انسانی ہوگا؛ لیکن وہ خود بھیڑیا ہوگا۔

مغربی معاشرہ اخلاقی اقدار وروایات، دینی اصول واحکامات کے نہ ہونے کی وجہ سے فساد وبگاڑ، اخلاقی انارکی وابتری کی انتہا کو پہنچ گیا ہے اس کے نظام حیات کا شیرازہ پورے طور سے بکھر چکا ہے وہاں کے اہل فکر ودانش جو انسانی لباس کے ساتھ انسانی دل وجذبات رکھتے ہیں اس کا شدت کے ساتھ احساس کرنے لگے ہیں، یورپ ہی سے شائع ہونے والی کتاب ''مغرب کی موت''(The Death of the west Patrick-JBuchanan) میں اس کا کھلے طور پر اظہار کیا گیا ہے، پیٹرک 'ج' بوکنان جیسے فلاسفر نے یہ پیشین گوئی کی ہے کہ یوروپ میں بہت جلد معاشرہ کا تصور ہی ختم ہوجائے گا، مغربی تہذیب وتمدن کے ایک مبصر کا بیان ہے کہ یوروپ میں تہذیب وتمدن کے ارتقا کی تمام راہیں مسدود ہوچکی ہیں، یہ کوئی قابل تعجب انکشاف نہیں، ہر ایک اس سے واقف ہے اس لئے یوروپ میں قتل وغارت گری، ظلم وزیادتی، عزت وآبرو کی پامالی، خودکشی کے واقعات اور مختلف قسم کے جرائم کا گراف دن بدن بڑھتا جارہا ہے یہ صورت حال محض ان پسماندہ شہروں کی نہیں جہاں تہذیب وتمدن اور علم کی شعاعیں نہیں پہونچیں بلکہ متمدن اور ترقی یافتہ شہروں کی مثلاً ماسکو، نیویارک، واشنگٹن، لندن، برلن، پیرس، اٹلی، اسپین اور یونان کے اکثر متمدن شہروں کا کم وبیش یہی حال ہے۔

دورِ تحقیق میں حقائق کی پامالی

موجودہ زمانہ درحقیقت تحقیق و تجزیہ، فہم و بصیرت اور علم و دانش کا زمانہ ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے مختلف علمی اکیڈمیاں، انجمنیں، اجتماعی و اقتصادی تنظیمیں اور ٹیکنیکل لیبارٹریز سرگرم عمل ہیں۔ ان اداروں کے فیض سے انسانی معرفت و آگہی ترقی کی راہوں پر گامزن ہے، نئی نئی ایجادات و اختراعات وجود میں آرہی ہیں اور محققین و ریسرچ اسکالرز کے درمیان تحقیق و تفتیش کے نئے میدانوں کی دریافت اور نئی نئی معلومات کی فراہمی کے لیے مقابلہ آرائی ہو رہی ہے۔

دنیا کو نئی معلومات سے نوازنے اور تحقیق کے لیے نئے میدانوں کو تلاش کرنے کی تمنا ان میدانوں کی دریافت سے آگے جا چکی ہے جن تک پہنچنے کا تصور بھی قدیم انسانوں کے حاشیۂ خیال میں نہ تھا۔ عصر حاضر میں دنیا میں مختلف ایسی تنظیمیں معرض وجود میں آئی ہیں جو بحث و تحقیق کے میدانوں کے انتخاب میں تعاون و دست گیری کر رہی ہیں، اور محققین پہاڑوں کی چوٹیوں کو تو کیا، سمندروں کی اتھاہ گہرائیوں کو بھی اپنی جولان گاہ بنائے ہوئے ہیں۔ جیسا کہ کوہ پیماؤں کی ایک جماعت نے قطب جنوبی میں انٹارک نیکا کی تسخیر کا کارنامہ انجام دیا۔ بعینہ اسی طرح کوہ پیماؤں کی ایک دوسری جماعت ہمالیہ کی بلند ترین چوٹیوں تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی، جب کہ دوسری مختلف جماعتیں اور تنظیمیں پہاڑوں کی بلندیوں، گھنے اور گنجان جنگلات کے اندرونی حصوں اور سمندروں کی اتھاہ گہرائیوں میں نامعلوم مقامات کی کھوج اور انوکھی شئے کے حصول کی خاطر پہاڑوں پہ

کمندیں ڈال رہی ہیں، سمندر کی تہہ کھنگالی جارہی ہے، خوفناک جنگلات میں پارکوں کی طرح چہل قدمی کی جارہی ہے۔ اسی طرح آثار قدیمہ کی تحقیقات کا بھی سلسلہ جاری ہے، جن میں قدیم تہذیب وتمدن اور مردہ ثقافت وکلچر کا سراغ لگایا جاتا ہے۔ اس عمل کے جاری رہنے کے ساتھ ساتھ انسانی علم ومعرفت میں ترقی وپیش رفت بھی ہوتی ہے اور ان معلومات کے ذریعہ روشن وتابناک ماضی سے انسان کا ربط بھی بڑھتا ہے، اور دنیا کے کونہ کونہ میں آباد انسانوں کے حالات وکوائف سے آگاہی بھی ہوتی ہے۔

ریسرچ اسکالرز کی ایک جماعت اپنی تحقیق سے ایسی رپورٹیں تیار کر کے اخبارات میں شائع کرتی ہے جو دنیا کے مختلف علاقوں کی عمومی صورت حال کے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہیں، یہ ادارہ جو مذکورہ انسانی تحقیقات کی نگرانی کرتا اور ہدایات دیتا ہے، ایمنسٹی انٹرنیشنل کے نام سے مشہور ومعروف ہے۔ اسی طرح ایک تنظیم وہ ہے جو حیوانوں کے ساتھ نرمی ورواداری اور محبت آمیز سلوک برتنے میں دلچسپی لیتی اور اسے اہمیت دیتی ہے۔ اسی طرح بچوں کی دیکھ بھال اور ان کی تعلیم وتربیت کے متعلق ایک عالمی ادارہ ہے، تعلیم وثقافت کے لئے بھی ایک تنظیم قائم ہے، کچھ ادارے ایسے بھی ہیں جن کا مقصد اصلی حیوانوں کی زندگی اور جنگلات کی حفاظت ونگہداشت اور درندوں کی بعض اقسام کو ہلاکت وضیاع سے محفوظ ومامون رکھنا ہے۔ ایک دوسری تنظیم قدیم عبادت گاہوں، کتب خانوں اور تاریخی نقوش وآثار کی حفاظت کے لئے کوشاں ہے اور کچھ تنظیمیں ایسی بھی پائی جاتی ہیں جو مختلف طبقوں کے لوگوں کے رجحانات اور عادات واطوار کے بارے میں معلومات جمع کرتی ہیں۔

ایک دوسری تنظیم قیدیوں کے ساتھ کئے جانے والے سلوک سے متعلق ہے بعض تحقیق کرنے والے گذشتہ جنگوں کے بارے میں معلومات جمع کرتے ہیں ایسی ہی ایک عالمی تنظیم نے حال میں ایسی اجتماعی قبروں کا سراغ لگایا ہے جن میں سیکڑوں اور ہزاروں جنگی

قیدی ابدی نیند سو رہے ہیں۔ چنانچہ اس نے کمبوڈیا، سابق یوگوسلاویہ اور سوویت یونین میں مختلف اجتماعی قبروں کا انکشاف کیا ہے۔ چند برسوں پہلے اس تنظیم نے جرمنی میں بھی بعض اجتماعی قبروں کے بارے میں تحقیق کی ہے جن کا سلسلہ نازیوں کے عہد اور سوویت یونین روس کے کمیونسٹ اقتدار کے زمانے سے جا کر ملتا ہے، سابق یوگوسلاویہ کے علاقے میں بھی ایسی قبریں دریافت کی گئی ہیں، جن کا تعلق بوسنیا کی جنگ وخونریزی سے ہے جس میں صربوں نے لاکھوں مسلمانوں کو تہ تیغ کر ڈالا اور انھیں اجتماعی طور پر دفنا دیا۔

روانڈا میں بعض غیر مدفون اور منتشر انسانی ڈھانچے بڑی تعداد میں گرجا گھروں کے سامنے بھی ایک ساتھ ملے ہیں۔ گرجا گھر کے سامنے پائے گئے ان انسانی ڈھانچوں کی تصویریں برطانوی میگزین ''اکنومسٹ'' میں شائع ہوئی ہیں۔ مذکورہ میگزین نے روانڈا میں ہوئی اس خونریزی وغارت گری کے واقعہ کو تفصیل سے شائع کیا ہے جس میں پانچ لاکھ افراد قتل کیے گئے اور اس قتل کے جرم میں گرجا گھر کے ذمہ داران وکارکنان بھی شریک رہے۔ تحقیق کے دوران مزید آٹھ ہزار افراد کے بہیمانہ قتل کا پتہ چلا ہے۔ متحدہ اقوام کی ایک ٹیم نے اس کی اطلاع دی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس طرح کی کوششیں اور انکشافات انسانیت کی ایک خدمت ہیں، اجتماعی قبریں جن کا سراغ بعض جویانِ حقائق نے لگایا ہے، دشمنان اسلام کے ان دعووں کو غلط ثابت کرتے ہیں کہ مذہب اسلام جبر وتشدد اور درندگی وبے رحمی سے عبارت ہے کیونکہ یہ اجتماعی قبریں ان لوگوں کی ہیں جو غیر مسلم افراد کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتارے گئے، بلکہ کمبوڈیا، سوویت یونین روس اور یوگوسلاویہ میں لاکھوں کی تعداد میں قتل کیے جانے والے یہ مقتولین مسلمان ہی ہیں جنھیں دشمنانِ اسلام نے شہید کر دیا۔ اور آج بھی یہ وحشیانہ کارروائیاں جاری ہیں جیسا کہ اشتراکی نظام کے متعلق شائع شدہ رپورٹوں سے معلوم ہوتا ہے کہ لاکھوں مسلمانوں کو ان مقامات کی جانب شہر بدر کر دیا گیا جو

زندگی کے لئے قطعاً ناسازگار اور ناقابلِ رہائش ہیں۔ اور لاکھوں کی تعداد میں ان کا خون بھی بہایا گیا۔ اسی طرح اشتراکیت کی مخالفت کی بنا پر انھیں سزائے موت بھی دی گئی۔

جن اجتماعی قبروں کا بعض تحقیقی تنظیموں نے سراغ لگایا ہے اور جن کی خبریں ذہنوں سے اس لئے محو ہو کر رہ گئی ہیں کہ ذرائع ابلاغ نے ان کو دبا دیا۔ اس طرح کی خبریں ایک بار تو منظرِ عام پر آئیں لیکن پھر روپوش ہو گئیں جب کہ پوری دنیا میں نظر بند افراد اور ان اشخاص کی تعداد کے بارے میں، جو قید خانوں میں روح فرسا سزاؤں کا سامنا کر رہے ہیں، مختلف رپورٹیں اور تجزیے شائع کئے جاتے ہیں۔ تنظیم حقوق انسانی کی رپورٹوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً تیس ہزار اسلام پسند نفوس ایک اسلامی ممالک میں صرف اس بنیاد پر قید خانوں میں تکالیف و شدائد اور کرب و اندوہ سے دوچار ہیں کہ وہ شریعت اسلامیہ کے نفاذ، یا ملک کی اصلاح حال کا مطالبہ کر رہے ہیں، ان جانبازوں میں ایسے افراد بھی شامل ہیں جن کا اس تحریک سے کوئی تعلق نہیں؛ بلکہ وہ تو صرف ان مردانِ کار اور صاحبانِ جاں نثار کے تئیں ہمدردی و غمگساری کا جذبہ رکھتے ہیں، یا دینی رجحان کے حامل ہیں، یا عبادت ربانی کو غیر معمولی اہمیت دیتے ہیں، یا ان بعض قوانین و ضوابط اور عادات و معمولات کی مخالفت کرتے ہیں، جو ان کے عقیدہ کے منافی ہیں۔

اس تنظیم کی پیش کردہ معلومات سے پتہ چلتا ہے کہ مختلف پارٹیاں ممنوع قرار دی گئیں، اخبارات ضبط کیے گئے اور مدیروں کو سزائیں دی گئیں۔ اور یہ سب کچھ محض اس لئے ہوا کہ انھوں نے رہنمایانِ مملکت میں سے کسی کی شخصیت یا موجودہ نظام پر تنقید و نکتہ چینی کی۔ ان رپورٹوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان ہزاروں قیدیوں کے سلسلہ میں نہ تو کوئی عدالتی فیصلہ لیا گیا اور نہ ہی انھیں اپنے امر واقعہ کے پیش کرنے یا اپنی برأت کے اظہار کا موقع دیا گیا۔

اس قسم کی عالمی تنظیمیں ایسی رپورٹیں بھی تیار کر کے شائع کرتی ہیں جو دنیا میں پناہ

گزینوں کی حالت، عورتوں کی اجتماعی عصمت دری اور انھیں زدوکوب کرنے کے واقعات پر مشتمل ہوتی ہیں، یہ خبریں منظر عام پر آنے کو تو آتی ہیں؛ لیکن اس کے بعد نگاہوں سے اوجھل ہوجاتی ہیں، کیونکہ یہ خبریں عموماً مشرق ومغرب ہر دوسمت کے یورپین افراد کی وحشیانہ خباثت کا پردہ چاک کرتی ہیں۔ خواہ یہ پناہ گزیں حکومت کی ظالمانہ کارروائیوں کے ذریعہ جلاوطن کئے گئے ہوں، جو اسلام اور شیدائیان اسلام کے خلاف کی جاتی ہیں، یا انہی حکومتوں کی ہدایت پر شہر بدر ہوئے ہوں۔ ان رپورٹوں سے پتہ چلتا ہے کہ پناہ گزینوں میں بہتر فیصد (۷۵٪) سے بھی زائد تعداد مسلمانوں کی ہے۔

اسی طرح اس حقیقت سے بھی آشنا ہیں کہ غیر اسلامی ممالک میں حجاب و پردہ نشینی اور دعوت اسلامی پر عائد شدہ پابندیوں اور عقیدۂ وثقافت کی بنیاد پر شہریوں کے مابین فرق وامتیاز کرنے کا تسلسل آج بھی برقرار ہے۔ اخبارات کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ ایک مسلم ملک میں محض اس بنا پر کہ ووٹرس نے اسلامی نظام کے حق میں ووٹ ڈالے، الیکشن کے نتائج تبدیل کردیے گئے اور ایک ایسی فوجی حکومت مسلط کردی گئی جو اپنے ہی شہریوں کے ساتھ وہ معاملہ کرنے لگی جو دشمن ملک کی فوج کے ساتھ جنگ کے موقع پر کیا جاتا ہے۔

سب ہی جانتے ہیں کہ ایک ملک میں اکثریتی فرقے کی ایک مقدس شخصیت کی توہین کرنے کے الزام میں دو افراد کے خلاف دائر کردہ مقدمے نے پورے یورپ میں رد عمل کے شعلے بھڑکا دیئے اور دنیا میں زلزلے کی سی کیفیت پیدا ہوگئی۔ لیکن آج بھی ہزاروں اسلام پسند محض اس الزام میں قید بامشقت کی صعوبتیں برداشت کررہے ہیں کہ وہ یورپ کی تہذیب وتمدن کی مخالفت کے مرتکب ہیں، جب کہ سیکڑوں قیدیوں کی جانیں ضائع کردی گئی ہیں؛ لیکن کوئی بھی ملک ان کے حقوق کی حفاظت کے لئے میدانِ عمل میں نہیں آیا۔

بدنام زمانہ مصنف سلمان رشدی اور حیا سے عاری تسلیمہ نسرین کی مذہب اسلام کی تحقیر وتذلیل کرنے والی کتابوں پر پابندی عائد کرنے کے مطالبہ کی بنا پر شدید ترین رد عمل

سامنے آیا، پورا یورپ مصنف و مصنفہ کی حمایت کے لئے آمادہ ہو گیا اور ان کتابوں کو رواج عام اور عوامی مقبولیت حاصل ہوئی جب کہ سیکڑوں اسلامی کتابیں ایسی ہیں جن پر پابندی عائد کر دی گئی ہے، جو نہ تو کتب خانوں میں ملتی ہیں اور نہ ہی انھیں کتابوں کی نمائش میں شامل ہونے کی اجازت دی جاتی ہے۔ ان کتابوں کے مصنفین پر مقدمے چلائے گئے اور انھیں جیلوں میں نظر بند کر دیا گیا۔ لیکن ان تمام چیرہ دستیوں کو آزادیٔ لوح و قلم اور حریت فن و ادب کے سلب کر لینے سے تعبیر نہیں کیا گیا۔

بلاشبہ یہ حقائق اس بات کے مستحق ہیں کہ جو تنظیم آئندہ نسل کے استفادہ کی غرض سے حقائق و معلومات اور اعداد و شمار جمع کرتی ہے وہ ان حقائق پر بھی اپنی نظر التفات مرکوز کرے تا کہ موجودہ نسل موجودہ یورپ اور عصر حاضر کی زندگی کے متعلق اپنے مطمح نظر کی تصحیح کر سکے۔ کیونکہ یہ وہ حقائق ہیں جنھیں ذرائع ابلاغ ایک بار تو ضرور پیش کرتے ہیں لیکن پھر ان سے چشم پوشی و لاعلمی برتتے ہیں۔ جب کہ یہی ذرائع ابلاغ بعض پارٹیوں یا بعض افراد کی غیر دانشمندانہ کوششوں کی متفرق تفصیلات مسلسل پیش کرتے رہتے ہیں جن کا مقصد محض اسلام و شیدائیان اسلام پر دہشت گردی یا جبر و تشدد کی الزام تراشی و تہمت زنی ہوتا ہے۔

یہ معلومات اور اس کے علاوہ بہت سے دیگر حقائق اور اعداد و شمار ایسے ہیں جو روئے زمین کے حالات کی ترجمانی کرتے ہیں اور جن کی نہ صرف مطالعہ و معاینہ؛ بلکہ انھیں بطور ریکارڈ محفوظ رکھنے کی بھی اشد ضرورت ہے تا کہ یہ معلومات امر واقعہ کی حقیقت کو پیش کرنے میں مدد و معاون ثابت ہو سکیں؛ کیونکہ انسان کی قوت حافظہ کمزور واقع ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نہاں خانۂ ذہن میں صرف وہی معلومات باقی رہتی ہیں جنھیں یکے بعد دیگرے یا پے در پے بطور یاد دہانی کے دہرایا جاتا رہے، جیسا کہ موجودہ ذرائع ابلاغ خود اپنی وضع کردہ تعبیر ''اسلامی دہشت پسندی'' کے تعلق سے کر رہے ہیں۔

خیر وشر کی تمیز کا فقدان

مغربی مفکرین کا ایک نظریہ ہے جس کو عالم اسلام کے مغرب زدہ لوگوں نے آنکھ بند کر کے قبول کرلیا ہے کہ عہد وسطیٰ ظلم وتشدد کا عہد تھا، سختیاں تھیں، پابندیاں تھیں، بندشیں تھیں، آمرانہ نظام تھا، نہ آزادی تھی اور نہ آزادی کا نام، اور نہ سیاسی معاملات میں حصہ لینے کی آزادی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ماضی میں شخصی حکومتیں قائم تھیں اور یہ شخصی حکومتیں یورپ میں بھی تھیں اور ایشیا میں بھی اور افریقہ میں بھی۔ اس وقت دولت کے حصول اور معیار زندگی کو بلند کرنے کے ایسے مواقع حاصل نہیں تھے جو آج کے صنعتی عہد میں کمپنیوں اور فیکٹریوں کی کثرت اور تجارت کے پھیلاؤ کی وجہ سے حاصل ہیں اور سرمایہ کاری کے لیے تنظیموں کے قیام اور علمی اور فنی ماہرین کی کثرت اور قوت خرید، درآمد برآمد کی سہولت، علم وفن کی ترقی، ایک ملک سے دوسرے ملک جانے کی آسانیاں جو اس وقت میسر ہیں وہ پہلے نہیں تھیں، موجودہ تہذیب کی یہ ایک بڑی کامیابی ہے جس میں وہ عہد ماضی سے بہتر ہے، لیکن انسانی زندگی کو بحیثیت انسانی زندگی دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان تمام سہولیات اور عصر حاضر کی کامیابیوں اور صنعتی ترقیوں اور معیار زندگی کی بلندی کے باوجود انسان پریشانیوں، پابندیوں اور جبر وقہر سے آزاد نہیں ہوسکا؛ بلکہ اس میں اضافہ ہی ہوا ہے، ہاں پریشانیوں کے نام اور شکلیں ضرور بدل گئی ہیں۔

حقیقت حال کی واقفیت کے لیے ایمنسٹی انٹرنیشنل کی وہ رپورٹس کافی ہیں جو وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہتی ہیں جو موجودہ دنیا میں انسانی حقوق کی صورت حال بیان کرتی ہیں، یہ

رپورٹیں ایک آئینہ کے مانند ہیں جس میں بآسانی موجودہ عہد کی شکل دیکھی جاسکتی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ظلم واستبداد، بیجا مداخلت، بنیادی حقوق سے محرومی اور رنگ ونسل کے اختلاف، سیاسی فکر ونظر کی ناموافقت اور طرز معاشرت کے فرق کی وجہ سے ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ، ایک طبقہ دوسرے طبقہ کے ساتھ، ایک حکومت اپنے عوام کے ساتھ کس کھلی جارحیت کا مظاہرہ کررہی ہے، اس کے لیے بہت زیادہ غور وخوض اور کسی گہری نظر کی ضرورت نہیں؛ بلکہ اس کے ادراک کے لیے عقل عام کافی ہے۔

مسلح کشمکش، انسانی لہو کی ارزانی، پرتشدد کارروائیاں پوری دنیا میں عام ہیں۔ چھوٹی بڑی طاقتوں کے ہاتھ اس سے رنگین ہیں، اس کی زندہ مثال پناہ گزینوں کا ایک ملک سے دوسرے ملک کو ہجرت کرتا ہوا یہ سیلاب بلا ہے جو بڑھتا جارہا ہے اور اس کے لیے اقوام متحدہ کا ایک مستقل ادارہ ہے، جن کی تعداد قدیم عہد کی پوری دنیا کی آبادی کے برابر ہوگئی ہے، باصلاحیت، اہل لیاقت اوری جینیس لوگ اپنے اپنے ملکوں میں آزاد نہیں ہیں، ان کی بڑی تعداد دوسرے ملکوں میں آباد ہونے پر مجبور ہوتی ہے، سیاستدانوں، دانشوروں اور سابق وزیروں کو اپنی جانوں کا خطرہ ہے اور اپنے وطن میں انہیں عدم تحفظ کا احساس ہے، انسان کو اذیت پہنچانے کے لیے زہریلی گیس اور ہلاکت خیز ہتھیاروں کا عام رواج ہے اور اس زہریلے مادہ کے لیے بڑے بڑے کارخانے قائم ہیں، ناتواں لوگوں پر یلغار موجودہ دنیا کی ایک عام سی بات ہے، سیاسی اور اجتماعی دونوں میدانوں میں اس کا یکساں مظاہرہ کیا جارہا ہے، تاریخ سے اگر کسی کو کچھ بھی لگاؤ ہے تو وہ اس بات کی تصدیق کرنے پر مجبور ہوگا کہ آج اقتدار وقوت کے حصول کے لیے جائز وناجائز جو وسائل اختیار کیے جاتے ہیں، ان سے قدیم دنیا ناواقف تھی، اور عوام اسی طرح بے بس ہیں جس طرح قدیم عہد میں تھے۔

جو ممالک پسماندہ وکمزور ہیں انھیں جس انداز میں مختلف قسم کی ریشہ دوانیوں اور سیاسی دباؤ کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، اس کی مثال ماضی کی تاریخ میں نہیں ملتی، اس دباؤ کے

لیے انوکھی تدبیریں اختیار کی جاتی ہیں جن سے ظلم کرنے والا اپنی کارروائی کا جواز تلاش کر لیتا ہے ان کی سازشوں سے انقلاب رونما ہوتے ہیں، حکومتیں بدلی جاتی ہیں، ارباب حکومت بدلے جاتے ہیں، ملک کی سیاسی پالیسی بدلی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ انقلاب عوام کی مرضی سے عمل میں آیا ہے، حالانکہ عوام کا کوئی تعلق اس سے نہیں ہوتا۔

نئی طاقت برسر اقتدار آتی ہے تو اگلوں کے کام اور ان کی پالیسی کو یک قلم منسوخ کر دیتی ہے اور ان کے آثار تک کو محو کر دینے پر تُل جاتی ہے، ان کے ہر اقدام پر لعن طعن کی بارش کی جاتی ہے اور ملک کو ایک نئی جہت پر ڈالنے کی ہر ممکن کوشش ہوتی ہے، حکام فرضی انتخاب میں بڑی اکثریت سے منتخب ہوتے ہیں، جیل خانوں کو پرانے قیدیوں سے خالی کر کے نئے قیدیوں سے بھرا جاتا ہے، قیدیوں کو جن میں اہل علم و دانش اور اہل فکر اور اہل ثروت اور مصلح ہوتے ہیں، سخت جسمانی اذیتیں دی جاتی ہیں، اکثر جھوٹے الزامات لگا کر جبراً ان سے اعتراف جرم کروا کر ان کو موت کی سزا دیدی جاتی ہے۔ غارت گری، جنگوں اور حملوں کا سلسلہ ہر دور میں رہا اور اس دور میں بھی ہے لیکن پناہ گزینوں کے خیموں پر حملوں اور اپنے گھروں میں میٹھی نیند سونے والوں کا بے دریغ قتل۔ لڑکوں اور شیر خوار بچوں حتی کہ شکم مادر میں معصوم جانوں کو یک لخت ختم کر دینے کا جنون، خدا کے حضور میں سجدہ ریز بے گناہ بندوں کا اجتماعی قتل اور تجارتی مرکزوں، فیکٹریوں اور کارخانوں کو نذر آتش کرنا اور لوگوں کو زندہ جلا دینا، عبادت خانوں اور مسجدوں کا غاصبانہ انہدام، کتب مقدسہ کی بے حرمتی اور محض عقیدہ کے اختلاف، فکر و نظر کی نا اتفاقی کی وجہ سے مختلف قبیلوں اور قوموں کا علم و فن اور ذرائع معاش سے محرومی، رنگ و نسل کی بنیادوں پر امتیازی سلوک جس طرح اس زمانہ میں عام ہے قدیم زمانہ میں اتنا عام نہ تھا اور آج کی طرح اس زمانہ کی حکومتیں اور بڑی طاقتیں ان ظالمانہ اقدار پر اس طرح ایمان نہیں رکھتی تھیں جس طرح آج کی ترقی یافتہ اور حریت و مساوات کی علمبردار طاقتیں نہ صرف یہ کہ ایمان رکھتی ہیں؛ بلکہ ان کو برت رہی ہیں اور دوسری طرف عہد

وسطیٰ کا بنظر حقارت جائزہ بھی لیتی رہتی ہیں۔

ہمیں یہ تسلیم ہے کہ علم وفن اور صنعت وحرفت کے امکانات اس عہد میں بہت وسیع ہیں، لیکن اس علم وفن اور صنعت گری سے انسانیت کی تعمیر کے بجائے اس کی تخریب کا زیادہ کام لیا جارہا ہے، اگر کسی کو یقین نہ ہو تو مختلف ملکوں میں دفاع کے وسائل پر جو کچھ خرچ کیا جارہا ہے اس کو دوسرے رفاہی کاموں پر خرچ ہونے والے اخراجات سے موازنہ کرکے دیکھ لے۔

بڑی طاقتیں عالمی مسائل میں یہ کہہ کر دراندازی کرتی ہیں کہ طاقت کے توازن میں فرق آرہا ہے اور اس کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کو باور کرائیں کہ کسی بھی علاقہ سے ان کے انخلا کے نتیجہ میں عدم توازن کا خطرہ ہے؛ لیکن یہ بھی کسی سے مخفی نہیں کہ ان کی ہر ادا کسی نہ کسی سیاسی مصلحت اور اندرونی داؤ پیچ کا نتیجہ ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ جہاں ان کی شدت سے ضرورت محسوس کی جاتی ہے وہاں ان کا کوئی کارندہ بھی نہیں پہونچتا اور جہاں ان کی قطعی ضرورت نہیں ہوتی وہ بن بلائے مہمان کی طرح آموجود ہوتی ہیں، ظالم ظلم کا جواز تلاش کرلیتا ہے اور اپنے ظلم کو مدد اور نجات دہندگی کا نام دیتا ہے اور مظلوم اپنی مظلومیت کا رونا روتا رہتا ہے اور اس کی دادرسی کرنے والا کوئی نظر نہیں آتا۔

بڑی طاقتوں کا یہ نفاق اور کھلا تضاد بوسنیا اور ہرزے گوینا کے سلسلہ میں کھل کر سامنے آیا، سوڈان، صومالیہ، افغانستان کے سلسلہ میں بھی ان کی پوزیشن دیکھنے میں آئی، امریکہ کے کمرشیل سینٹر میں دھماکہ کے سلسلہ میں امریکہ کی داداگیری بھی دنیا نے دیکھی اور عراق، تونس، لیبیا، مصر اور شام کے سلسلہ میں ان بڑی طاقتوں کا موقف دنیا دیکھ رہی ہے۔

عالمی مسائل کی سنگینی اور ان کی ژولیدگی کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس وقت دنیا میں کوئی غیر جانبدار طاقت، کوئی نیوٹرل تنظیم اور کوئی انصاف پرور نظام قائم نہیں ہے جو اصول وانصاف کی بنا پر عالمی مسائل میں ثالثی کرے اور ظالم کو ظلم کرنے سے روک دے اور مظلوم کی اشک شوئی کرے، یہ ایک ایسی صورت حال ہے جو پوری انسانیت کے لئے زبردست

خطرہ کا پیش خیمہ بنتی جارہی ہے۔

اقوام متحدہ کی یہ حیثیت تھی کہ وہ عالمی مسائل میں ثالثی کے فرائض انجام دے لیکن افسوس کہ وہ ان بڑی طاقتوں کے ہاتھوں میں ایک آلۂ کار سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی جو آپس میں ایک بلاک کی حیثیت رکھتی ہیں اور جن کے مصالح مشترک ہیں اور ایک ہی نظریہ کے حامل ہیں کہ کسی طرح نوع بشری کے مصائب سے فائدہ اٹھا کر ان کو دست نگر بنایا جائے اور سیاسی فائدہ اٹھایا جائے۔

انسانیت کا کوئی مسئلہ اس وقت تک حل نہیں ہوسکتا جب تک کہ کوئی ایسی طاقت سامنے نہیں آتی جو غیر جانبدار اور انصاف پرور ہونے کے ساتھ تمام مادی اغراض سے بالاتر ہو اور عالم انسانی کی مشکلات کے سامنے سینہ سپر ہوجائے اور ظالم کے سامنے چٹان کی طرح جم جائے۔

دنیا کی موجودہ حالت بد سے بدتر ہوتی جارہی ہے آج کا مغرب زدہ اور روشن خیال طبقہ موجودہ تہذیب وتمدن کی ترقیوں کا چاہے جس قدر دعویٰ کرے لیکن حقیقت یہ ہے کہ قبائلی اور نسلی امتیاز کا منحوس سایہ امریکہ یورپ اور افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں پر آج بھی مسلط ہے اور سفید فام نسل بڑی طاقتوں کی شہہ پر دوسری نسلوں کا استحصال کررہی ہے۔

موجودہ یورپ کا سیکولرزم بھی بے نقاب ہوگیا ہے، دینی انتہاپسندی اس وقت پورے یورپ میں عام ہے اس نے ساری دنیا کا چہرہ بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ اور ان کے نقوش وخطوط مٹادیے ہیں اور ان پر اپنا عقیدہ، اپنی زبان، اپنا کلچر تھوپنے کی کوشش کی جارہی ہے، کھل کر مسیحیت کی ترویج کی جارہی ہے، جو بھی عیسائی مشنریوں کی تعداد پر ایک طائرانہ نظر ڈالے گا اور پوپ کے دوروں کا جائزہ لے گا اور ان کے بیانات کو دیکھے گا اور مشنری نظام کے بجٹ پر اور ان کے بچھائے ہوئے جال پر غور کرے گا وہ اس کو تسلیم کرے گا کہ یہ مشنری نظام، یہ ہولناک جنگیں اور یہ خونریزیاں سب امریکہ، برطانیہ، روس، فرانس اور یورپی

ممالک کی تائید سے جاری ہیں اوران خونی ڈراموں اورانسانیت کواس بڑے پیمانہ پرغلام بنانے کے اقدامات متمدن طاقتوں کی کارستانی ہے۔موجودہ دنیا آتش فشاں کے دہانے پر کھڑی ہے،اخلاقیات،دیانت دارانہ معاملات سب کے سب رخصت ہوگئے ہیں،اصول پرعمل کرنا قدامت پرستی ہے،ساری دنیا ایک نظام کی غلامی میں مبتلا ہورہی ہے،ذرائع ابلاغ تک اب آزادنہیں ہیں،زراعت اورصنعت،تعلیم بھی مغربی حکومتوں کی تابعداری میں ہیں،اس کے باوجودمغربی تہذیب کی تقدیس اوراس کی ثناخوانی ترقی پسندوں کا شعار ہے،اس لیے کہ خیروشر کی تمیز جاتی رہی ہےاورعزت نفس کاوجودنہیں ہے۔

یہ تو ہونا ہی تھا

وہ نظام جو ہر نظام کو ختم کرنے اور ہر فکر کو رد کرنے کی بنیاد پر قائم تھا، آج ٹوٹ رہا ہے، اس نظام کے پابند ہر ملک میں بغاوت شروع ہوگئی ہے، اس نظام کی بنیاد بغاوت پر تھی، اس لیے اب وہ خود بغاوت میں مبتلا ہے۔

کمیونسٹ لیڈران کہا کرتے تھے کہ دین لوگوں کے لیے ''افیون'' ہے، لیکن لوگوں کے تجربہ نے ثابت کردیا کہ ان لوگوں کی حیثیت خود چرس اور گانجہ سے زیادہ نہیں، اور اس کے نظام کو قبول کرنے والی تمام حکومتیں صرف اس کے نشہ میں زندگی گذار رہی ہیں، اور ''بردلت یاری جنت'' کا خواب دیکھ رہی ہیں، لیکن وہ تمام خواب بکھر کر رہ گئے، اتنے بڑے نقصانات کے بعد جن کا کمیونسٹ نظام کو اپنانے والی حکومتوں کو سامنا کرنا پڑا، عوام کو بیداری کے بعد معلوم ہوا کہ وہ بیڑیوں میں جکڑے ہوئے تھے، اور ان کی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، اور وہ ان ممالک کے صدقات وعطیات کے محتاج ہیں جن کے خلاف یہ نظام برسر جنگ رہا ہے۔

یہ بغاوت مشرقی یورپ میں اٹھی اور کئی ممالک اس نظام سے آزاد ہوگئے، اور انھوں نے اشتراکیت سے انکار کردیا اور اس نظام کا اپنی گردن سے جوا اتار پھینکا، اب وسط یورپ اور روس کے درمیان بھی کشمکش جاری ہے جو کمیونزم کا آخری قلعہ ہے۔

مذہب Religion کو کمیونسٹ اور اشتراکیوں کے ہاتھوں ذلت وخواری کا منھ دیکھنا پڑا، اور کمیونزم کے فتنہ میں مبتلا لوگوں نے اس پر سنگین الزامات لگائے؛ لیکن ستر سال سے بھی کم مدت میں الزام لگانے والے خود مجرم کے کٹہرے میں کھڑے نظر آتے ہیں اور اشتراکیت کے نام پر جبر وتشدد کرنے والے ناکام ہوتے ہیں اور اپنے برے انجام تک

پہونچتے ہیں، جو باقی ہیں وہ اپنی باری کا انتظار کر رہے ہیں۔

مسلمانوں پر ایک الزام یہ تھا کہ وہ غیر مسلموں کو اپنے عقیدہ اور طرز زندگی کو اختیار کرنے پر مجبور کرتے تھے، تجربہ سے معلوم ہوا کہ اس جرم میں سب سے زیادہ مبتلا کمیونسٹ ہیں، جہاں کمیونزم کی مخالفت کی سزا موت ہے، اور جہاں غیر اشتراکی فکر کو سانس لینے کی اجازت نہیں۔

اس ظلم کی شہادت ہر اس ملک نے دی جس نے کمیونسٹ نظام قبول کیا، اب بہت سی حکومتیں اشتراکیت کے چنگل سے نکلنے کے لیے جد وجہد کر رہی ہیں، اس جد وجہد میں وہ ممالک بھی ہیں جو ترکوں کے زیر حکومت رہے، اور انہوں نے مسلم ترکوں پر استبداد اور دینی تعصب کا الزام لگایا، اب لوگ دونوں نظاموں کے درمیان تمیز کر سکتے ہیں۔

بلگاریا(Bulgaria) ایک یورپی ملک ہے، یہاں الزام تھا کہ ترک غیر مسلموں پر تشدد کرتے ہیں اور اسلام قبول کرنے پر مجبور کرتے ہیں، بلقان (Balkan) کی لڑائی کے بعد بلگاریا میں جو غیر ترکی حکومت قائم ہوئی، اس نے ظلم وتشدد کا ریکارڈ قائم کر دیا، مسلمانوں کا قتل عام کیا، جس کی خود مغربی حلقوں کی طرف سے تصدیق ہوئی، کمیونزم آنے کے بعد وہاں ہر طرح کی آزادی ختم کر دی گئی، یہاں تک کہ اسلامی نام رکھنے پر پابندعائد کی گئی، چین میں مسلمانوں کو ختنہ، دفن، ذبیحہ اور نکاح کے شرعی طریقوں سے روکا گیا۔

عثمانیوں نے غیر مسلموں کے ساتھ رواداری کا راستہ اختیار کیا، صلیبی، یورپی ممالک سے ان کی جنگ کے باوجود اور صلیبیوں کی کھلی دشمنی کے باوجود اس رواداری پر قائم رہے، چنانچہ عیسائیوں اور یہودیوں کو ملکی حقوق اسی طرح حاصل تھے جیسا کہ مسلمانوں کو حاصل تھے، اور ان کا معاملہ مسیحی حکومتوں کے ساتھ جنھوں نے ان کی موافقت نہیں کی تھی دوستی، محبت ومودت اور تعاون کا معاملہ تھا، انھوں نے بہت سے عیسائی ممالک کو دشمن کے پنجے سے چھڑایا، تاریخ کا مطالعہ کرنے والا تاریخ میں عثمانیوں اور بہت سے عیسائی ممالک کے درمیان اس تعلق

اور ان حقوق کی مثالیں پا سکتا ہے جو عیسائیوں کو حاصل تھے، ان کے عہد میں تعلیم، عمل اور حکومت کے مناصب کے میدان میں کوئی پابندی نہیں لگائی گئی، اس رواداری کا جیتا جاگتا ثبوت ان ممالک میں عیسائی آثار و نقوش کا وجود ہے جن پر ترکوں نے حکومت کی ہے۔

ان سب باتوں کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مسلم حکام خود اعتمادی سے مالا مال اور قول و عمل میں سچائی پر اعتماد کرنے والے تھے، اور خوف وحشت کی نفسیات سے دور تھے، اگر مسلمان اپنے دور حکومت میں جو صدیوں تک پھیلا ہوا ہے، اس سیاست پر عمل کرتے جس کا آج ان کے دشمن ان پر الزام لگاتے ہیں تو ان کے ملک میں غیر مسلموں کی اتنی بڑی تعداد نہ ہوتی، ان کی زبان و ثقافت باقی نہ رہتی، اور ہر غیر اسلامی اثر و وجود کا بالکلیہ خاتمہ ہو جاتا۔

پوری تاریخ میں دین کی بنیاد پر ظلم و ستم یا خوفناک حادثات اس طرح کے نہیں ملتے جن کے مظاہر روس میں دیکھے گئے، انھوں نے روس میں مسلمانوں کی زمینوں پر قبضہ جمایا، اور اپنے دینی شعائر اختیار کرنے سے ان کو روکا، اسی طرح مشرقی ایشیا اور افریقہ کی حکومتوں میں دینی اور سیاسی و اقتصادی عقیدہ کے نام سے ظلم و ستم ہوا، یہ سب کچھ اس دور میں ہوا جو حریت و آزادی، وحدت و مساوات، اور حقوق و رواداری کا دور کہلاتا ہے، اور جو اقوام متحدہ کا دور ہے، جس میں مذہبی، لسانی، اور ثقافتی آزادی اور سیکولرازم اور مساوات کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔

وہ لوگ جو مسلمانوں پر اپنے عقیدہ و ثقافت کو دوسروں پر تھوپنے کے لیے قوت کے استعمال کا الزام لگاتے ہیں، انھوں نے خود ہر اس فکر کو روکنے کے لیے دوگنی تگنی قوت استعمال کی جو ان کی فکر کے منافی ہو، اور انھوں نے زبردست وسائل و ذرائع کے ساتھ دین و مذہب سے جنگ کی، اس لیے کہ ان کا تصور اس سے متعارض تھا۔

یہ بات عملی اور فکری میدان میں بھی دیکھی جا سکتی ہے، یورپ میں تقریباً پچاس سال کے اندر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو دجل، جھوٹ، مسخ و تحریف کے وسائل استعمال کیے گئے اور جو کچھ لکھا گیا اس کا مقابلہ وہ تحریریں نہیں کر سکتیں، جو ایک ہزار سال

کے اندر عالمی مذاہب کے خلاف لکھی گئیں، اور یہ عمل برابر وسیع دائرہ میں جاری ہے، اس کے نتیجہ میں اسلام کے خلاف ایک مکمل کتب خانہ تیار ہو گیا۔

یہ ہے دشمنانِ اسلام کی فطرت وطبیعت جس کا اسلام اور مسلمانوں کو ہر دور میں سامنا کرنا پڑا، دشمنان اسلام کی آج بھی یہی فطرت ہے جیسا کہ کل تھی۔

وہ مسلمانوں پر الزام لگاتے ہیں کہ انھوں نے عبادت گاہوں کو منہدم کر دیا، اور ان کو مساجد میں تبدیل کر دیا، حالانکہ صرف تین یا چار عبادت گاہیں ایسی ہوں گی جن کے بارے میں ان کا دعویٰ ہے کہ وہ ان کے ملبہ پر بنائی گئی ہیں، اس کے مقابلہ میں ہزاروں مساجد دنیا کے مختلف حصوں میں شہید کی گئیں، گذشتہ پچاس ساٹھ سال کے اندر روس، چین، البانیہ، یوگوسلاویہ، برما، میانمار اور وسطی افریقہ میں مسجدوں کو قہوہ خانوں اور میوزیم میں تبدیل کر دیا گیا، نماز پر پابندی لگائی گئی، حلال گوشت کے استعمال، دفن کے طریقہ، اور قرآن شریف کی تعلیم پر پابندی لگائی گئی، وہ کہتے ہیں کہ اسلام نے علم وفن کو ختم کر دیا، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اسلام نے لاطینی زبان اور یونانی علوم کو زندہ کیا اور ان کو وسعت دی، جب کہ یورپینس نے دوسری اقوام کے علوم ومعارف کو تلف کیا، ان کی زبانوں کے خلاف تحریک چلائی، کتب خانے تباہ کیے، مدرسے توڑے، وہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں نے غیر مسلموں کو دین اسلام کے قبول کرنے پر مجبور کیا؛ حالانکہ اس کی ایک بھی مثال نہیں دے سکتے، اس کے برعکس ایسے ممالک پائے جاتے ہیں جن میں مسلمانوں کو اپنے دین سے دست بردار ہونے پر مجبور کیا گیا اور کھلے طور پر ان کو اپنے دین سے الگ ہونے کی دعوت دی گئی اور مسلمانوں کو دھمکی دی گئی کہ وہ اپنی تہذیب وتاریخ سے دستبردار ہو جائیں ورنہ ان کو ملک سے بھگا دیا جائے گا، یا ان کا خاتمہ کر دیا جائے گا، اس کے بغیر ملک میں ان کے رہنے کا کوئی حق نہیں ہے، اور وہاں کی حکومت اس طرح کی تحریکات کو روکتی نہیں ہے، اسی طرح فلپائن، ایتھوپیا اور بہت سے غیر اسلامی ممالک میں اسلامی سرگرمیوں کو روکنے اور مسلمانوں کو اسلام دشمن افکار کے قبول

کرنے پر مجبور کرنے کے لیے قسم قسم کے وسائل اختیار کیے گئے اور کیے جارہے ہیں، یہ لوگ مسلمانوں پر فرق ومذاہب کے تعدد واختلاف کا الزام لگاتے ہیں اور اپنے ادیان میں تعدد مذاہب اور گہرے اختلافات پر پردہ ڈالتے ہیں، کون نہیں جانتا اس جنگ وجدال کو جو پروٹسٹنٹ اور کیتھولک اور دوسرے مسیحی فرقوں کے درمیان پیش آئے؟ اگر محققین ان الزامات کی تحقیق کریں جو وہ اسلام پر لگاتے ہیں تو انھیں معلوم ہوگا کہ ہر برائی ان کے اندر مسلمانوں سے بدرجہا زیادہ پائی جاتی ہے۔

اشتراکی نظام نے اپنا انجام دیکھ لیا؛ کیوں کہ وہ مذہب کا عام طور پر، اسلام کا خاص طور پر جانی دشمن تھا، اور اس نے روزِ اول ہی سے دین کے خلاف سخت جنگ لڑی، وہ مذہب کو اپنا سب سے پہلا دشمن سمجھتا تھا، لیکن تھوڑی سی مدت میں اس کی ناکامی سامنے آئی اور عنقریب انشاء اللہ تعالیٰ دوسرا یورپی نظام بھی ختم ہوجائے گا جس نے اسلام سے علمی وفکری جنگ لڑی، اگرچہ ظاہر میں وہ رواداری ظاہر کرتا تھا؛ لیکن خفیہ طور پر اسلام ومسلمانوں کے خلاف سازش کرتا تھا اور حقائق مسخ کرکے پیش کرتا تھا، اس نے عالم اسلام پر ایسے حالات طاری کیے جو اس کی بے چینی واضطراب میں اضافہ کررہے ہیں۔

یقیناً یہ جماعت جو صہیونیت، صلیبیت اور یورپی قومیت کے ساتھ ملی ہوئی ہے، جو عالم اسلام کا استحصال کرتی ہے اور اس کو مختلف مسائل ومشکلات میں پھنساتی ہے، عنقریب اس کو بھی افتراق وانتشار کا سامنا کرنا پڑے گا، اس سے نہ امریکہ بچ سکتا ہے نہ فرانس اور برطانیہ، روس کے حالات ان سب طاقتوں کے لیے تازیانہ ہیں، جو فوجی طاقت کے بل پر قائم ہیں، قوموں کا عروج وزوال تاریخ کا ایسا عمل ہے جو مؤخر ہوسکتا ہے، ٹل نہیں سکتا۔

وسیعلم الذین ظلموا أی منقلب ینقلبون۔

تعمیر کے پردہ میں تخریب کے سامان

اس میں شک نہیں کہ مغربی تہذیب نے انسانی زندگی کو سہولتوں اور آسائشوں سے معمور کر دیا ہے، اس نے انسان کے ان مسائل اور دشواریوں کو جن کا وہ صدیوں سے سامنا کر رہا تھا، بڑی حد تک حل کر دیا ہے، عقل اور علم نے تحقیق کے نئے میدان تلاش کئے ہیں، اور علمی ترقی کے ایسے ذرائع و وسائل انسان کو حاصل ہو گئے ہیں، جن کا پہلے تصور ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اس تہذیب نے یونانی اسلامی سرمایہ میں گرانقدر اضافہ کر کے انسانی معلومات میں غیر معمولی اضافہ کیا، جس کے نتیجہ میں انسان قدرتی وسائل کے بڑے حصہ پر قابض وحاوی ہو گیا، کسی زمانہ میں اسٹیم اور بھاپ و پٹرول کی قوت سے چلنے والی سواریوں کی ایجاد حیرت انگیز سمجھی جاتی تھی؛ لیکن اب ایسی سواریاں وجود میں آچکی ہیں جن کی رفتار آواز کی رفتار سے کہیں زیادہ تیز ہے، میڈیا، ذرائع ابلاغ و مواصلات نے تصور و خیال سے زیادہ ترقی حاصل کی ہے۔ اس تہذیب نے انسان کو زندگی کی وہ آسائشیں دیدی ہیں جو پہلے حکام، اور امیروں کو بھی میسر نہ تھیں، قابل ذکر بات تو یہ ہے کہ ان کے جائز و صحیح استعمال کی نہ کوئی حد ہے اور نہ ہی ناجائز و بے جا استعمال سے روکنے کی کوئی شرط اور نہ اس میں کوئی امتیاز یا پابندی، اس نئی تہذیب نے آپس کے ربط وضبط، تعلق اور اتحاد و اتفاق کی طاقت کو بڑھایا ہے، جس کے نتیجہ میں معاشرہ کا ہر فرد عزت و شرافت، سکون و اطمینان کی زندگی سے حقوق کی محافظ تنظیموں اور قوانین کے سایہ میں بہرہ مند ہو رہا ہے۔ ان تنظیموں اور قوانین کے تحفظ، اور ان کے نظم وضبط کو منظم کرنے کے لئے ایسی ایجنسیاں قائم کی گئی ہیں، جو ان کے معیار کو مزید بلند کرنے اور ان کے مخالفین کو ان کے تابع کرنے کی کوشش کر رہی ہیں، اس

تہذیب نے تعلیم وتربیت کے معیار کو بھی بلند کیا ہے، اور علوم کو عام کیا ہے اور اس میں اضافہ ہورہا ہے، ان کے ایسے ایسے وسائل واسباب مہیا کردیئے ہیں جن کے نتیجہ میں تقریباً ہر ملک میں سائنس کے ہر موضوع کے محققین اور ماہر سائنسدانوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے، اس نے طبی سہولتوں اور میڈیکل سائنس کی تحقیقات کے ذریعہ انسانی صحت کے وسائل فراہم کئے ہیں جو پہلے بہت محدود تھے۔

موجودہ تہذیب نے طاقت وقوت کی پیداوار اور انسان کے منافع، مصالح ومفاد میں ان کے استعمال کی صلاحیت کے معیار کو بھی بڑھادیا ہے یہ قوت وصلاحیت، زراعت وتجارت صنعت وحرفت اور میڈیکل سائنس کی تحقیقات میں استعمال کی گئی جس سے انسان کی ضرورت کی چیزوں کی پیداوار میں اور استعمال میں عظیم اضافہ ہوا ہے، ان صلاحیتوں سے موجودہ دور کا انسان فائدہ اٹھارہا ہے۔

مذکورہ بالا منافع، مصالح اور کوششیں لائق تحسین اور قابل ذکر ہیں، لیکن زندگی کے دوسرے شعبوں اور میدانوں میں تہذیب جدید نے بعض نقصان دہ رجحانات پیدا کئے ہیں، وہ ایک طرف جدید ہے تو دوسری طرف قدیم، مثلاً قدیم یونانی مکتب فکر سے اختلاف کے دعوے کے باوجود اس کے بہت سے اصول وضوابط، افکار ونظریات کو برابر گلے لگائے ہوئے ہے، قومی عصبیت اور مسیحیت سے اس کی وابستگی ناقابل تردید واقعہ ہے، کالے اور گورے کے درمیان امتیاز وتفریق، گورے کو کالے پر امتیازی تفوق، غلبہ کی چاہت، اسباب ووسائلِ زندگی سے لطف اندوزی، تسلی وتفریحی سامان کا ضرورت سے زیادہ اہتمام اس کا شعار بن گیا ہے اس کا ہر مفکر، مصنف، ادیب وانشاء پرداز اپنی فکر ارسطو سے جوڑنے کی کوشش کرتا ہے اور اسے اپنی معاشرت ومعیشت، تعلیم وتربیت، اور اخلاق کے جدید نظریات، افکار وخیالات کی بنیاد قرار دیتا ہے اسی طرح موجودہ مغربی تہذیب کا مسیحیت سے معاشرتی، فکری اور قلبی لگاؤ ہے اور اس میں اس کا انداز سلبی اور معاندانہ ہے، حالانکہ وہ دہریت والحاد کا دعویدار اور دین کے خلاف بغاوت کا علمبردار، نصرانیت کی ایک طرفہ جانبداری

کے تمام گوشے اس تہذیب کے دور سیادت وقیادت میں پوری دنیا کے سامنے ظاہر ہو چکے ہیں، اوراس کی نشر واشاعت، دعوت وتبلیغ کا اہتمام بھی واضح ہو چکا ہے، مسیحی مشنریوں پر بے تحاشہ خرچ، افریقہ وایشیا کے دور دراز علاقوں کو مسیحیت میں تبدیل کرنے کی چاہت وخواہش دو دو چار کی طرح واضح ہو چکی ہے، اور صلیبی جنگیں جو خود اس نے چھیڑی تھیں اب تک یورپ کے ہر مفکر کے ذہن پر چھائی ہوئی ہیں، غیر مسیحیوں سے انتقامی احساسات وجذبات تجربہ کی اس تلخی کو جلا دے رہے ہیں، اسلامی ملکوں کے ساتھ اس کے سلوک سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اسلامی ملکوں کو اپنے دباؤ میں لینے کے لیے اسلامی تحریکوں، تنظیموں کا خاتمہ کرنا، شرعی قوانین کے نفاذ پر پابندی عائد کرنا اور اسلامی ملکوں میں مسیحیوں کے حق میں کسی قسم کی زیادتی پر حد سے زیادہ تاثر کا اظہار اسی قبیل کی مثالیں اور ثبوت ہیں۔

ان تمام باتوں کی روشنی میں یہ حقیقت کھل کر سامنے آچکی ہے کہ یورپی تہذیب نہ تو سیکولر مزاج ہے اور نہ ہی خالص علمی یا موضوعی، اور یہ بات بھی واضح ہوگئی ہے کہ یورپی ممالک جہاں فرد، جماعت اور انسانی حقوق کے تحفظ کے سب سے زیادہ محافظ سمجھے جاتے ہیں، خود اپنی ماتحت قوموں کے ساتھ ہر قسم کا ظلم وستم، زیادتی وناانصافی روا سمجھتے ہیں اور ان پر اپنی ثقافت کو تھوپنا چاہتے ہیں، اور فقر وفاقہ، معیشت کی تنگی وبدحالی اور جہالت سے دوچار قوموں کو اپنی سامراجیت وبربریت کا شکار بناتے ہیں۔ ان کے مزاج کو بدلنے، ان کی تاریخ کو مسخ کرنے، اور ان کی قومی خصوصیات وتشخصات کا خاتمہ کرنے کے لئے وہاں کی حکومتیں اور تنظیمیں مسلسل کوشاں رہتی ہیں اور اس مقصد کے لئے جو ظالمانہ نظام ان ملکوں میں قائم ہیں ان کی یہ مغربی ممالک سرپرستی کرتے ہیں۔

موجودہ تہذیب کی واضح علامتوں میں سے یہ بھی ہے کہ علم دوستی، اس کی نشر واشاعت، آزادی رائے، علمی وفنی سرمایہ کی خدمت کی علمبردار ہونے کے باوجود وہ دوسری قوموں کے علوم وفنون کے سرمایہ کے ساتھ حاقدانہ اور معاندانہ معاملہ کرتی ہے۔ مستشرقین اور ان مغربی محققین کی طرح جنھوں نے عالمی آداب ولسانیات کو صفحۂ ہستی سے نیست ونابود کرنے، ان میں دوسرے

آداب ولسانی خصوصیات کو ناجائز طور پر شامل کرنے اور قومی رسم الخط کی جگہ لاطینی رسم الخط نافذ ورائج کرنے اور کمزور پچھڑی قوموں کو پرانی تہذیب وثقافت سے رشتہ وناطہ توڑنے کی انتھک کوشش کی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس تہذیب کے دور اقتدار اور عہدِ سامراجیت میں قومیں تباہ وبرباد کردی گئیں، دنیا کے مختلف گوشوں میں علوم وفنون، آداب ولسانیات کا خاتمہ کردیا گیا، اور یورپین ممالک نے اپنی تہذیب کو عام کرنے اور رواج دینے کے لئے نئی تاریخ وضع کی، تمام قوموں پر سفید فام نسل کے تفوق وامتیاز کو ثابت کرنے کی کوشش کی۔

کچھ عرصہ قبل ''جنوبی افریقہ'' اور ایشیا میں اور دور حاضر میں امریکہ میں نسلی امتیاز وتفریق کی سیاست اختیار کی گئی، مسلم ملکوں کی اکثریت کے خلاف مغرب کا رویہ، اس کی دوہری پالیسی کی علامت ہے، اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ مغربی تہذیب کے اندرون ملک کے پیمانے کچھ ہیں اور بیرون کے لیے کچھ اور کسی طبقہ کے لیے کچھ اور کسی دوسرے طبقہ کے لیے کچھ اور۔

یہ دوہری پالیسی عہد سامراجیت اور اس کے دور زوال میں نہیں؛ بلکہ مسلسل جاری ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ یورپ نے ایک طرف تعمیری کارنامے انجام دیئے ہیں تو دوسری طرف تخریبی، کبھی علمی وتحقیقی کارنامہ انجام دیا ہے تو کبھی ان علمی وتحقیقی کارناموں کے بہتر نتائج کو تاخت وتاراج کردیا ہے۔ اگر ایک طرف معیشت ومعاشرت کو بلند کیا ہے، تو دوسری حیثیت سے مادی منفعت کے پیچھے دوڑ اور ناجائز سیاست کے نتیجہ میں اس کو پریشانیوں اور دشواریوں کا شکار بھی بنادیا ہے جس کا نتیجہ ہے کہ افریقہ اور ایشیا کے لاکھوں انسان فقر وفاقہ سے دوچار ہوکر لقمۂ اجل بن رہے ہیں، اور یورپ میں اشیاء خوردنی کی اتنی بہتات اور کثرت ہے کہ اس کے وافر مقدار کو دریا برد کرکے تباہ وبرباد کردیا جاتا ہے، اس طرح مغربی تہذیب نے جہاں زندگی کی مشکلات، دشواریوں اور کشمکش کو حل کیا ہے، وہیں دوسری ایسی پریشانیاں اور پیچیدگیاں بھی پیدا کردی ہیں جس کے لیے لوگوں کا خون بہایا جارہا ہے۔

ٹریجڈی اور کامیڈی

ٹریجڈی اور کامیڈی دو الگ الگ مناظر ہیں، ٹریجڈی سے ضمیر جاگتا ہے اور قلب بیدار ہوتا ہے، سنجیدگی آتی ہے، شعور زندہ ہوتا ہے، پوری فضا الم رسیدہ اور پورا ماحول کبیدہ ہو جاتا ہے، کرب وقلق چھا جاتا ہے، اور ہر زندہ و باشعور انسان جس کے سینہ میں دھڑکتا ہوا دل اور جسم میں دیدۂ بینا اور گوشِ شنوا ہوتا ہے، وہ دوسرے انسان کی اس تکلیف دہ اور پریشان کن صورتِ حال پر خون کے آنسو روتا ہے اور اس میں مدد کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور اس کی انسانیت بیدار ہوتی ہے۔

دوسری طرف تفریح (کامیڈی) سامان سکونِ قلب، باعث فرحت و مسرت غذا ہے جس سے غم واندوہ، پریشانی وتکان، مصیبت وتکلیف کے بادل چھٹ جاتے ہیں، ذہن کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے، بے فکری اور تسلی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔

یہ دو مختلف چیزیں ہیں، ان کے رجحانات واثرات بھی بالکل جداگانہ ہیں، ٹریجڈی اور کامیڈی کا اجتماع ناممکن ہے، پھر فطرت وطبیعت کے لحاظ سے انسانوں میں بھی فرق ہوتا ہے، کچھ لوگ ٹریجڈی ہی کو پڑھنا وسننا چاہتے ہیں، جبکہ کچھ لوگ کامیڈی کی طرف زیادہ میلان رکھتے ہیں، مصنفین، ادباء، قصہ نگار، ناول نگار، افسانہ نگار اور ڈرامہ نویس بھی حیات انسانی کے پہلوؤں وگوشوں کی تصویر کشی میں الگ الگ انداز ومیلان رکھتے ہیں، کوئی سارا زور، شقاوت، مصائب، المیوں اور غم والم ہی کی منظر کشی پر صرف کرتا ہے، تو کوئی خوشیوں، مسرتوں اور تسکینِ قلبی کے مناظر کی تصویر کشی میں اپنی ساری مہارت صرف کرتا ہے، حسن اتفاق اگر کوئی ان متضاد صنفوں کو کامیابی سے جمع کر لے جائے تو وہ عبقری اور نادرۂ روزگار

وبے مثال مصنفین میں شمار کیا جاتا ہے، مگر یہ اجتماع خال خال ہی دیکھنے میں آتا ہے۔

لیکن آج کے ہمارے میڈیا کا یہ کمال ہے کہ وہ دونوں فنوں کو ایک ہی وقت میں پیش کرنے میں مہارت رکھتا ہے، جہاں بدبختی، محرومی، مصائب اور خوشیاں، مسرتیں اور تقریبات ساتھ ساتھ چلتے ہیں، ہم آئے دن دیکھتے سنتے ہیں کہ ایک جگہ سے آہ ونالہ، فریاد اور درد وغم کے مناظر پیش کئے جارہے ہیں، آبرو لٹ رہی ہے، انسان وطن چھوڑنے اور اپنی جان بچانے پر مجبور ہیں، کسمپرسی کے عالم میں اجنبی جگہوں اور ماحول میں بے آسرا و بے سائبان خوراک و پوشاک کی ضروری مقدار سے بھی محرومی کے ساتھ زندگی کی گھڑیاں گزرانے پر مجبور ہیں، ان کے پاس اپنی آبرو کی حفاظت کا کوئی ذریعہ نہیں ہے، ایک طرف یہ صورت حال ہے تو دوسری طرف اس سے قریب ہی کسی جگہ پر لوگ مست اور داد عیش دے رہے ہیں، شادیانے بج رہے ہیں، اسراف کا مظاہرہ ہورہا ہے، شوخیاں ہورہی ہیں، دل بہلایا جارہا ہے، اور اس خوشی کے عالم میں انھیں یہ احساس تک نہیں ہوتا کہ ان کے بھائیوں پر کیا مصائب ڈھائے جارہے ہیں، وہ کن دل دہلانے والی آزمائشوں سے دوچار ایسی زندگی پر ماتم کناں ہیں۔

ٹریجڈی وکامیڈی کے یہ دونوں مناظر بیک وقت اس دنیا میں آئے دن سامنے آتے ہیں، جسے ذرائع ابلاغ بڑی مہارت، فنکاری، باریک بینی اور اہتمام سے شائع کرتے اور پھیلاتے ہیں۔ انسانی المیوں، مصائب، ناقدریوں، تنگ دلی اور سختیوں کا منظر اور بے فکری اور تفریح کا منظر زندگی کے یہ متضاد مناظر ہر معاشرہ، خاندان اور گھرانہ کے سامنے ہیں، چاہے وہ ٹیلی ویژن کے ذریعہ پیش کیے جائیں، یا ریڈیو، یا اخبار وجرائد کے ذریعہ، ان متضاد مناظر سے ہر انسان کو سابقہ پڑتا ہے، مجلس ومحفل کا موضوع گفتگو یہی ہے مگر کتنا عجیب وحیرتناک ہے یہ تضاد، اور اس تضاد کا زندگی پر کیا اثر پڑسکتا ہے، مثال کے طور پر ایک منظر یہ ہے، دس لاکھ سے زائد انسان اپنا وطن کوسوو چھوڑ کر البانیہ میں پناہ گزین ہوئے، قتل عام کا

لامتناہی سلسلہ چلا، جو صربوں کے ہاتھوں ہوا، بموں، دھماکوں گولیوں اور نہ جانے کتنے تباہ کن وسائل ہیں جنھیں یوگوسلاویہ نے جوش انتقام میں استعمال کیا۔ یہ دونوں مناظر مصائب و آلام، ابتلاء و آزمائش کا ثبوت تھے، مستقل خبریں آرہی تھیں کہ کوسوو میں مسلم عورتوں کا اجتماعی اغوا و غصب، مسلمانوں کا قتل عام، بھاری توپوں کی مدد سے آبادی کی بربادی، گاؤں کے گاؤں جلانا اور تباہ کرنا، بچوں اور عورتوں کا قتل عام سی بات ہے، اخباری رپورٹوں سے پتہ چلا کہ صربوں نے بچوں کی آنکھیں پھوڑ دیں، دل نکال لیے، مردوں تک کے ساتھ مجرمانہ اور بہیمانہ سلوک کیا، زیورات کی لالچ میں مقتول عورتوں کی انگلیاں کاٹ ڈالیں۔

یہ تھا انسانیت سوز منظر جس میں دس لاکھ سے زائد انسانوں کو اپنے وطن سے بے آبرو و بے سہارا ہوا کر البانیہ میں کسمپرسی اور تنگ حالی کے عالم میں رہنے پر مجبور کیا گیا، کوئی خیموں اور کیمپوں میں رہا، تو کوئی بلا کسی ذریعہ وسہولت کے پہاڑوں پر پناہ گزیں ہوا۔

دوسری جانب ناٹو کی فوجوں نے یوگوسلاویہ پر بمباری کی، پورا ملک برباد ہو گیا، یہ تھا وہ دل سوز منظر جس سے پوری دنیا باخبر ہوئی اور میڈیا کے مختلف ذرائع سے یہ اطلاعات ملیں۔

لیکن یہ منظر تیزی سے پلٹ جاتا ہے اور حیات انسانی کی دوسری تصویر سامنے آتی ہے، یہ دوسرا منظر پہلے منظر کے برعکس غم کا بوجھ ہلکا اور انفعالی جذبات واثرات کو ختم کر دیتا ہے، یہ منظر تھا ورلڈ کپ کا جس کے میچز لندن میں ہو رہے تھے، ورلڈ کپ ایشیا، افریقہ، آسٹریلیا اور برطانیہ میں بسنے والے افراد کا موضوع گفتگو اور اصلی مشغلہ بن گیا تھا، یہ ممالک مقابلہ میں شریک و سہیم تھے، نوجوانوں، ادھیڑ عمر حتی کہ بوڑھوں تک میں اس کھیل سے دلچسپی اس درجہ بڑھ چکی تھی کہ تماشائیوں کو دوسرے ضروری کاموں سے بیگانہ ولا پروا کر ڈالا، کرکٹ سے اس قدر دلچسپی کو ایک صحافی نے بخار کا نام دیا، انگلش روزنامہ ''ٹائمس آف انڈیا'' میں شائع ہوا کہ کرکٹ کا بخار ایشین لوگوں میں پھیل چکا ہے، اور چین کی اس سخت گیر حکومت نے بھی جہاں بیرونی ٹیلی ویژن چینل دیکھنے پر پابندی تھی، شدید اصرار پر

انڈین ٹیلی ویژن چینل پر آنے والے کرکٹ میچ دیکھنے کی اجازت دے دی۔

اخباروں میں تفصیلات آرہی تھیں کہ خلیجی ممالک خاص طور سے متحدہ عرب امارات میں کرکٹ میچوں سے دلچسپی اور توجہ بڑھتی جارہی ہے، حد یہ ہے کہ جن کے پاس ٹیلی ویژن نہیں ہے وہ مارکیٹوں اور عام شاہراہوں میں نصب ٹیلی ویژنوں پر بھیڑ لگا کر میچ دیکھتے ہیں، اسی کے پیش نظر ایرانڈیا نے اعلان کیا کہ وہ اپنی پروازوں میں کرکٹ میچ کے مناظر دکھلائے گا اور غذائی سامانوں کے لیے کرکٹ کی اصطلاحات استعمال کرے گا۔

اخبارات، کھلاڑیوں کی تصویریں، حالات اور میچوں کے سلسلہ میں تبصرے اور تجزیے روز چھاپتے رہے، تو اگر ایک طرف کوسووا اور یوگوسلاویہ کے دل سوز وخونی المیے اخباروں کی سرخیوں میں آرہے تھے تو دوسری طرف ان میچوں کی تصویریں اور خبریں کئی کئی صفحوں کو گھیر رہی تھیں۔

کھیل پر یہ خاص توجہ ہی ہے کہ ہر خورد وکلاں کھیل کے سارے مراحل سے واقف ہے، لوگوں کی زبانیں کھلاڑیوں کے ناموں کا ورد کرتی رہتی ہیں اور کامیابیوں وناکامیوں کے ریکارڈ واعداد وشمار کا تذکرہ ہر جگہ ہوتا ہے۔

کرکٹ کا جنون اس درجہ بڑھ چکا ہے کہ ہندوستان کے نوجوانوں نے ایک جلوس نکالا جس کے ایک بینر پر یہ لکھا تھا کہ: کرکٹ ہمارا مذہب ہے، اور ایک کھلاڑی کے بارے میں لکھا تھا کہ وہ ہمارا خدا ہے۔

ہندوستان میں صرف ایک مہینہ میں اخباری اطلاعات کے بموجب ۵/لاکھ ٹی۔وی سیٹ خریدے گئے، پاکستان جب بنگلہ دیش سے ہارا تو بڑی تعداد میں ٹی۔وی سیٹ غصہ میں توڑ دیے گئے۔

روزانہ اخباروں میں کرکٹ سے اس دلچسپی کے نہ جانے کتنے ایسے عجیب وغریب واقعات شائع ہوتے ہیں کہ کوئی دانا وبینا ان کی تصدیق نہیں کرسکتا۔ اس صورت

حال کا خاص طور سے ان ملکوں میں پایا جانا افسوسناک ہے، جو فقر وافلاس، جہالت وپسماندگی، بیکاری، انتظامی کرپشن، اجتماعی ظلم وبے راہ روی، طبقاتی کشمکش جیسی نہ جانے کتنی مشکلات میں مبتلا ہیں۔

کھیل کود کی اہمیت سے اور زندگی کی تعمیر میں اس کے اثر سے کوئی انکار نہیں کرسکتا ہے، یہ مختلف ناموں اور مختلف شکلوں میں ہر دور میں اہمیت کا حامل رہا ہے، جسمانی صحت کے ساتھ انسان کی تفکیر اور ذہنی صلاحیت پر بھی اثر پڑتا ہے، لیکن اس کا ایک دائرہ ہے اور اس کی کچھ حدیں ہیں جن کا اگر خیال نہ رکھا جائے تو زندگی کا توازن بگڑ جاتا ہے، مشرقی قومیں چونکہ جذباتیت کا شکار ہیں، اس لیے ہر چیز میں جذباتی ہوجاتی ہیں اور اعصاب متاثر ہوجاتے ہیں، یہ جذباتیت اور اعصاب کی کمزوری مغربی قوموں میں نہیں پیدا ہوتی۔ اس لئے وہ توازن قائم رکھتی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ حالات کے مطابق زندگی کے مختلف شعبوں میں تناسب اور اعتدال پیدا کیا جائے۔

جرم کی بالادستی

ملکی اور بین الاقوامی سطح کے اخبارات ورسائل کے اہم موضوعات میں جرائم کا بھی شمار ہوتا ہے، جرائم کے متعلق رپورٹیں اور تفصیلات بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کی جاتی ہیں، چاہے وہ جرائم اخلاقی اور جنسی ہوں، یا لوٹ مار، قتل اور ڈکیتی سے متعلق ہوں، بعض اخبارات میں کچھ صفحات خاص ہوتے ہیں اور بعض تو پورے کے پورے جرائم ہی سے متعلق ہوتے ہیں، ان رپورٹوں کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے اور آنکھیں کھلتی ہیں کہ اس وقت پورے عالم میں سماجی جرائم اور اخلاقی گراوٹ کا تناسب کس تیزی کے ساتھ بڑھ رہا ہے، اس کے لیے کیسے کیسے نت نئے طریقے اختیار کیے جارہے ہیں۔

سب سے زیادہ حیرت اس پر ہے کہ اس اخلاقی انارکی اور جرائم کا تناسب ان ملکوں میں بڑھا ہوا ہے، جو زیادہ متمدن وترقی یافتہ کہلاتے ہیں، ان میں سرِفہرست امریکہ ہے، جہاں اس کثرت وزیادتی کے ساتھ جرائم پیش آتے ہیں کہ حکومت بھی جرائم کے اس سیل تند وتیز کو روکنے سے عاجز ودرماندہ ہے، سماجی جرائم کا رجحان وہاں کے معاشرہ میں اس قدر رچ بس گیا ہے کہ اب اس کو تفریح طبع وتسلیٔ قلب کا ایک مفید ذریعہ سمجھا جاتا ہے، چنانچہ بغیر کسی فائدہ ومنفعت کے ایک دوسرے کو قتل کردینا اب وہاں کے لیے کوئی بڑی بات نہیں رہی؛ بلکہ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی معمولی تجربہ کے لیے یا محض تفریح طبع کے لیے کسی کو قتل کردیا گیا، یا کوئی اور غیر انسانی حرکت کی گئی۔

امریکہ کے سلسلہ میں جو رپورٹیں شائع ہوتی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ امریکی دارالسلطنت واشنگٹن میں اس طرح کے وحشیانہ اور غیر انسانی اعمال کا ارتکاب دنیا

کے دوسرے ممالک اور شہروں سے بڑھا ہوا ہے، اعداد وشمار کے مطابق امریکہ کے اس شہر میں ہر سال اس طرح سے قتل کیے جانے والوں کی تعداد چار ہزار تک پہونچتی ہے، بلکہ ماہر جرائم ''جیمس فوکس'' کے قول کے مطابق یہ تعداد آنے والے سالوں میں بڑھتے بڑھتے مزید چھ ہزار تک پہونچ جائے گی، یہ ایک ایسا معاشرتی اور سماجی بگاڑ ہے جس نے امریکی سوسائٹی کے در وبام کو لرزہ براندام کر رکھا ہے، ان وبائی جرائم کے خطرناک ومہلک اثر سے نہ کوئی گھر محفوظ ہے اور نہ کوئی رسٹورنٹ، ان خطرات کے پیش نظر امریکہ کے بعض ہوٹلوں میں ٹھہرنے والوں کو یہ تاکید کی جاتی ہے کہ سورج ڈوبنے کے بعد وہ اپنے کمروں سے باہر نہ نکلیں، گلی کوچوں میں چلنے پھرنے سے بھی احتیاط کریں، حتی کہ دن میں بھی وہ اس سے بچیں، اور اس کی بھی تاکید کی جاتی ہے کہ ہر کس وناکس کی دستک پر وہ دروازہ نہ کھولیں جب تک کہ ان کو پورا اطمینان اور کامل یقین نہ ہو جائے کہ دستک دینے والا شخص اس ہوٹل سے متعلق ہے، یا یہاں کا ملازم ہے؛ کیوں کہ بہت ممکن ہے کہ دروازہ کھٹکھٹانے والا کوئی مجرم ہو جو اس پر اچانک حملہ کر بیٹھے۔

جرائم کا وقوع موجودہ زندگی کا طرۂ امتیاز اور جزء لازم بن گیا ہے، اس کی لپیٹ سے نہ انفرادی زندگی محفوظ ہے نہ اجتماعی، عام طور پر اس طرح کے جرائم دوستوں، خاندانوں، میاں، بیوی، والدین اور بچوں کے درمیان قتل، بدسلوکی، ظلم وزیادتی اور لوٹ کھسوٹ کی صورت میں پیش آتے ہیں اور اس کثرت سے پیش آتے ہیں کہ لوگ ان اخلاقی برائیوں کو اپنی آنکھوں سے ہوتا ہوا دیکھتے ہیں؛ مگر ان کے اندر اس پر نکیر کی جرأت نہیں پیدا ہوتی؛ بلکہ رفتہ رفتہ وہ ان جرائم کے ایسے عادی ہو جاتے ہیں کہ ان کو اس کی فکر وپرواہ بھی نہیں ہوتی کہ ان کا معاشرہ کدھر جا رہا ہے۔

ارتکاب جرائم میں امریکا کے بعد روس ہے؛ جہاں اس وقت جرائم کا تناسب بہت بڑھا ہوا ہے، روس کے اخبار ''ازویستیا'' (Izvestiya) نے وہاں کے جرائم کے متعلق

حال میں جو تفصیلات پیش کی ہیں وہ بہت ہی دلدوز ہیں جن کو پڑھ کر ایک شریف طبیعت رکھنے والے انسان کو گھن آنے لگے، اس نے اپنی رپورٹ میں یہ بھی ذکر کیا ہے کہ اس وقت حکومت روس پر جرائم پیشہ لوگوں کا تسلط ہے، اس کی سیاست میں وہی دخیل ہیں، وہاں کا معاشرہ بھیانک جرائم کی دلدل میں پھنسا ہوا ہے۔ خاص طور سے اشتراکی نظام کے سقوط وزوال کے بعد اس رجحان نے اور زور پکڑا، اس کا سبب یہ ہے کہ اس نظام سے قبل وہاں کی زندگی قید وبند میں جکڑی ہوئی تھی اور لوگ دولت سے واقف نہ تھے، لوگوں کو اپنی ذاتی ملکیت ومال میں تصرف کرنے کا کوئی حق بھی حاصل نہیں تھا؛ بلکہ ان کو ان کی کمائی سے ایک محدود ومتعین رقم دیجاتی تھی جس پر وہ گذارا کرتے تھے، لیکن جب کمیونزم کے ظالمانہ نظام پر زوال آیا، آزادی کے دروازے کھلے اور لوگوں کو اس کا موقع ملا کہ وہ جس طرح چاہیں اور جیسا چاہیں تصرف کریں، تو اس کے نتیجہ میں اسیری کی زندگی گذارنے والوں میں ہوس کی آگ ایسی بھڑکی کہ قتل وغارت گری، لوٹ کھسوٹ، آبروریزی وعصمت دری کا بازار گرم ہوگیا، جرائم کے سوتے ابل پڑے، ہر طرف ظلم وزیادتی کے شعلے بھڑکنے لگے، اس رجحان سے اہل سیاست نے سب سے زیادہ فائدہ اٹھایا؛ اپنے مخالفین کے زور وقوت کو توڑنے کے لیے انہوں نے جرائم پیشہ اور سماج دشمن عناصر کی خدمات حاصل کیں؛ بلکہ بعض اخباری رپورٹوں میں یہاں تک ذکر ملتا ہے کہ روس کے اکثر بڑے بڑے لیڈر ''مافیا گروپ'' سے تعاون لیتے رہے، خود روس کے اعلی ذمہ داروں نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے کہ ماسکو کے اقتصادی، انتظامی اور سیاسی شعبوں پر مافیا گروپ کے لوگ حاوی ہیں۔

یہ موجودہ روس کا دلخراش نقشہ ہے اور جو جمہوریتیں اس کے زیر نگیں ہیں ان کا حال بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے، البتہ اتنا فرق ضرور ہے کہ روس اس بارے میں پیش پیش ہے، دیگر ترقی یافتہ ومتمدن ممالک میں بھی سماجی جرائم کا یہ رجحان روز افزوں ہے، اس سلسلہ میں امریکا وروس کے بعد جو ممالک سرفہرست ہیں وہ برطانیہ، فرانس،

پرتگال، اسپین اور اٹلی ہیں، ان میں بھی اٹلی کو اس اعتبار سے تفوق حاصل ہے کہ یہاں دہشت گردوں اور مافیا گروہوں کو تربیت دی جاتی ہے، ان کو جرائم، دہشت گردی اور تشدد کے گُر و ہُنر سکھائے و بتائے جاتے ہیں، اس بنا پر اٹلی تخریب پسند عناصر کا سب سے بڑا گڑھ اور اڈہ ہے۔

اٹلی میں اس قسم کے لوگوں یا رجحان کا وجود کوئی نئی بات نہیں ہے؛ بلکہ تشدد اس کی سرشت میں داخل ہے، کیونکہ اٹلی ہی وہ ملک ہے جس میں منظم دہشت گردی جو مافیا کے نام سے موسوم ہے وجود میں آئی، وہیں سے یورپ و امریکا کے دیگر ممالک میں منظم مجرمانہ رجحان کو فروغ ہوا۔ ''مافیا'' کے متعلق آکسفورڈ ریفرنس ڈکشنری میں تحریر ہے ''کہ'' مافیا ایک خفیہ تنظیم ہے، حکومتوں کی مخالفت اور دستور و قانون کی خلاف ورزی اس کا بہترین مشغلہ ہے، مقصد براری کے لیے جرائم کے اسباب و وسائل کو اختیار کرنا اس کے لیے کوئی بڑی بات نہیں ہے، اس کی ابتدا تیرھویں صدی میں ''سسلی'' (Sisli) میں ہوئی، مگر دیکھتے ہی دیکھتے اس کا دائرہ اثر شمال و جنوبی امریکا کے ان اطالوی تارکین وطن کے اندر پھیل گیا جو اپنے آپ کو Cosanastra کہتے ہیں، پھر رفتہ رفتہ امریکا کی مجرمانہ زندگی کے اندر اس کی جڑیں پیوست ہوتی چلی گئیں، اور ایسی راسخ ہوئیں کہ اب صورت حال یہ ہے کہ یہ رجحان امریکی زندگی و معاشرہ کا ایک حصہ بن گیا ہے، مقاصد کے حصول کے لیے جائز و ناجائز وسائل اختیار کرنے کا فلسفہ جو اس وقت سیاست عالم کا اہم عنصر ہے خود اطالوی مفکر ''میکاویلی'' (Machiavelli) کا پیش کردہ ہے، مذکورہ ممالک صرف یہی نہیں کرتے کہ وہ انفرادی و اجتماعی دہشت گردی و اخلاقی برائیوں کے جراثیم کو لوگوں کے اندر عام کرتے ہیں؛ بلکہ ملکی و حکومتی پیمانے پر بھی معاشرہ میں اس قسم کے رجحان کو فروغ دینے کے لیے کوشاں رہتے ہیں، اگر اس کی نظیر دیکھنی ہو تو سامراج کی طویل تاریخ اٹھا کے دیکھئے، جب یورپ نے دوسری قوموں کو محکوم و غلام بنانے کے لیے ظلم و ستم کے پہاڑ ڈھائے، مغلوب قوموں کو طرح طرح کی اذیتیں پہونچائیں، اس سے بڑھ کر انسانی آبادیوں کو تہس نہس کر کے رکھ

دیا، ان کا تمدن، کلچر، زبان وادب، ان کے قومی اطوار وعادات کو پامال کرنے کے لیے نہ جانے کتنے طریقے اپنائے، ان قوموں اور ملکوں کو اپنی خواہشات کے سامنے سرنگوں ہونے اور اپنی مرضیات میں جو جنگیں ہوئیں ان میں طرح طرح کے ظلم وسرکشی کے ذلت آمیز اور انسانیت سوز حربے اختیار کیے گئے۔

ظاہری اعتبار سے سامراج کا دور اگرچہ ختم ہوگیا، مگر اب تک اس کا ظالمانہ نظام ومستبدانہ سلسلہ اسی زور وقوت کے ساتھ جاری ہے جو پہلے تھا، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے پاس جنگی آلات اور ساز وسامان کا بے پناہ خزانہ ہے، مادی وسائل کی اس کے پاس کمی نہیں، میڈیا پر جو عصر حاضر کا سب سے طاقتور وکامیاب ہتھیار ہے، اس کا تسلط ہے، اسی قوت وتفوق کے پیش نظر چھوٹے چھوٹے ملکوں میں بھی یہ شعور پیدا ہوچلا ہے کہ جب تک مغرب کی نقالی وتقلید نہیں کی جائے گی اس وقت تک ترقی کی راہیں ہموار نہیں ہوسکتیں، اس لیے انھوں نے رطب ویابس اچھی یا بری ہر چیز میں اس کی نقالی شروع کردی ہے، حتی کہ جرائم جیسی گھناؤنی شی میں بھی وہ یورپ کے پورے مقلد ہیں اور ان کو اس بات کا شدید احساس ہے کہ انفرادی، اجتماعی وملکی سطح پر کامیابی کے لیے یورپ کی تقلید سے زیادہ کامیاب اور کوئی راستہ نہیں ہے، تاہم اس سلسلہ میں یہ ضرور ہے کہ جو ممالک تہذیبی اور تمدنی اعتبار سے یورپ کو اپنا امام ومقتدا گردانتے ہیں، بعض ان میں پورے طور پر یورپ کی تقلید کرتے ہیں اور بعض کچھ چیزوں میں، لیکن سب اسی کے دام فریب میں مبتلا اور اس کی زلفوں کے اسیر ہیں، مثال کے طور پر برصغیر کے ممالک کو لے لیجئے، ان میں ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش اور سری لنکا وغیرہ ہیں، یہ وہ ممالک ہیں جو فی الوقف یورپ کے ڈائرکٹ اثر سے اگرچہ دور ہیں، لیکن ایک عرصۂ دراز تک اسی کی آغوش تربیت وسرپرستی میں رہ چکے ہیں، اس لیے طبعی طور پر ان کے اندر یہ جذبہ پایا جاتا ہے کہ تمدنی ترقی میں وہ یورپ کی تقلید کریں، یہی وجہ ہے کہ اگر یورپ میں کوئی نئی چیز پیش آتی ہے تو اس کا پرتو یہاں بھی محسوس کیا جاتا ہے۔

طرفہ تماشا یہ کہ جرائم زدہ عناصر فن جرم میں مہارت پیدا کرنے کے لیے یورپ کی مجرمانہ تعلیمات کو اپناتے ہیں، اور اسی سانچے میں اپنے آپ کو ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں، بلکہ تعلیمی، ثقافتی اور اقتصادی حیثیت سے جو ممالک پسماندہ ہیں ان کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ اگر وہ علم وصنعت کے میدان میں یورپ سے آگے نہیں بڑھ سکے تو کم از کم جرائم ہی کے میدان میں یورپ پر اپنی برتری وتفوق ثابت کر دکھائیں اور اس سلسلہ میں وہ کام کر دکھائیں جو یورپ سے بھی نہیں ہو سکا۔

پاکستان کی سیاسی واخلاقی حالت کا وہاں پیش آنے والے واقعات سے جن میں ہر طرح کے جرائم ہیں، اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ یہاں جو دردناک والمناک حادثات پیش آرہے ہیں، دین ومذہب کے نام پر قائم ہونے والے مسلم ملک کے لیے ایسا باعث ننگ وعار ہے کہ سیکڑوں سال میں بھی جس کی شناعت کا ازالہ نہیں کیا جاسکتا۔ علاوہ ازیں وہاں کی معاشرتی زندگی نہ معلوم کن کن اخلاقی برائیوں آلائشوں سے آلودہ ہے۔ اسمگلنگ اور منشیات کی تجارت، قبائلی خونریزیاں، خانہ جنگیاں، ملکی سیاست میں جرائم زدہ عناصر کا اثر ورسوخ یہ وہ امور ہیں جو ایک مسلم ملک کے لیے صد بار باعث ذلت وعار ہیں۔

ہندوستان:۔ حکومت ہند نے ملک میں جرائم کے بڑھتے ہوئے رجحان کے اسباب کا جائزہ لینے کے لئے ایک کمیٹی کی تشکیل کی، کمیٹی کے سربراہ مسٹر وورا نے پارلیمنٹ کے ایوان میں جب جرائم کی رپورٹ پیش کی تو لوگ مبہوت ہو گئے، ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور اس وقت ان کو اندازہ ہوا کہ ملک کی باگ ڈور جرائم زدہ عناصر کے ہاتھوں میں ہے اور ان لوگوں نے حکومت کے اندر ایک اور حکومت قائم کر رکھی ہے، نیز بہت سی حکومتی کارروائیاں ان مجرم گروپ کے اشارے اور ایماء ہی سے کی جاتی ہیں، ملک کی اسی صورت حال سے متعلق الیکشن کمیشن کے صدر مسٹر شیشن نے یہ کہتے ہوئے اپنی رائے ظاہر کی کہ اگر الیکشن کے نظام کو درست کرنے کے لئے کوئی مثبت کارروائی واقدام نہیں کیا گیا تو

ملک مجرموں کے ہاتھوں میں ہوگا۔اور وہی یہاں کے سیاہ وسفید کے مالک ہوں گے۔

ایک اخباری رپورٹ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ملک کے اندر انتخابات میں منتخب ہونے والوں کی ایک تہائی تعداد ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جو جرائم زدہ ہوتے ہیں ان میں ایسے وزراء بھی ہوتے ہیں جو قانون کی نگاہ میں مجرم ہوتے ہیں۔اور ان پر قتل وغیرہ کے کیس ومقدمات عائد ہوتے ہیں اسی طرح وورا کمیٹی نے ایک اور ایسی رپورٹ پیش کی جس نے ہندوستان کے سیاسی حلقوں میں ہنگامہ برپا کردیا۔کہ مافیا گروہوں کو ملک کے سیاسی حلقوں کی تائید حاصل ہے جس سے ملک کی سلامتی خطرہ میں پڑگئی ہے، بلکہ اس کا انتظامی ڈھانچہ ونظام بھی درہم برہم ہوتا نظر آرہا ہے، کیونکہ ان جرائم پیشہ لوگوں نے ملک کے نظام وقانون کے متوازی اپنی طرف سے ایک نیا قانون وضع کررکھا ہے، جس سے ملک کا قانونی نظام معطل اور غیر مؤثر ہوتا جارہا ہے۔

ہندوستان کی سینٹرل انٹلیجنس کی ایک رپورٹ میں مزید کچھ اضافہ کے ساتھ اسی طرح کی تفصیل مذکور ہے، جرائم پیشہ لوگوں کو سیاسی لیڈروں کی حمایت وتائید حاصل ہے، حکومت کی طرف سے ان کو وسائل فراہم کیے جاتے ہیں، ان کے پاس مادی وسائل کی کمی نہیں، پولیس ان کی زیر فرمان ہے۔ارباب قلم واہل صحافت ان کے خلاف لکھنے سے لرزتے ہیں، کسی کو ہمت نہیں ہوتی کہ وہ ان کے خلاف ایک فقرہ لکھ دے، اس مجرمانہ رجحان کو سب سے زیادہ غذا وتقویت جس چیز سے مل رہی ہے وہ میڈیا اور ذرائع اشاعت ہیں، ان کی ساری تگ ودو صرف دو چیزوں کے اندر منحصر ہوکر رہ گئی ہے، ایک تو مجرمانہ رجحان کو پروانہ چڑھانا اور دوسرے جنسی جذبہ کو فروغ دینا۔

پہلے ارتکاب جرم کے دو بنیادی سبب قرار دیئے جاتے تھے، جہالت اور فقر وفاقہ، لیکن موجودہ دور میں اس کے برعکس ہورہا ہے، اب علم وہنر جرائم کے سرچشمہ ہیں، یہی وجہ ہے کہ جو ممالک جتنے زیادہ متمدن اور ترقی یافتہ ہیں وہاں اتنے ہی زیادہ جرائم رونما

ہورہے ہیں، خاص طور سے تعلیم یافتہ اور مالدار طبقہ اس کی طرف زیادہ راغب ہوتا ہے اور انہی گھرانوں وخاندانوں کے نوجوان زیادہ تر اس میں ملوث ہوتے ہیں۔

فن جرم میں کمال ومہارت پیدا کرلینا موجودہ دنیا میں حصول شہرت کا سب سے آسان وکامیاب طریقہ ہے، بسا اوقات ایسے شخص کی شہرت ملک کے بڑے بڑے علماء ولیڈران کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہوتی ہے۔اس کی شہرت واہمیت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب کہ وہ اسلام اوراس کے مقدسات کو اپنی تنقیدوں کا نشانہ بنائے، اوراس پر کیچڑ اچھالے،اس دور میں بہت ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ ایک شخص جس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی، گوشۂ گمنامی میں وہ اپنی زندگی کے لمحات بسر کرتا ہے؛ مگر جب وہ اسلام کے خلاف ہرزہ سرائی کرتا ہے تو پھراس کی شہرت چاردانگ عالم میں پھیل جاتی ہے،اس کی شخصیت بین الاقوامی،اس کا ادب، عالمی ادب قرار پاتا ہے، ہرطرف سے اس پر انعامات کی بارش ہوتی ہے،نوبل پرائز اس کو دیا جاتا ہے،نیشنلٹی اس کو ملتی ہے،سفر کی تمام سہولیات اس کو فراہم کی جاتی ہیں، دنیا کے بڑے بڑے قائدین ولیڈران اس کو مہمان بنانے پر فخر وسعادت محسوس کرتے ہیں اورایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس وقت پورے عالم کا معاشرہ کرپشن،سماجی برائیوں، مجرمانہ رجحان کے دلدل میں پھنسا ہوا ہے، چاروں طرف سے اس کو خطرہ لاحق ہے؛ کیوں کہ موجودہ معاشرہ کا کوئی شعبہ جرائم پیشہ عناصر کے وجود سے خالی نہیں ہے، چاہے وہ تعلیم وتربیت کے مرکز ہوں، یا سیاست کے وسیع حلقے، یونیورسٹیاں ہوں یا سرکاری دفاتر وکارخانے،اب یہ سارے کے سارے فساد وبگاڑ کے اڈوں میں تبدیل ہوگئے ہیں، مردم گری وانسان دوستی کے بجائے اب یہاں تخریب کاری وبددیانتی کی تعلیم دی جاتی ہے،اس سے بھی افسوسناک وخطرناک پہلو یہ ہے کہ بہت سی اصلاحی وتعمیری کام کرنیوالی تحریکوں وتنظیموں نے زمانے کے بدلتے ہوئے تیور ورجحان سے متاثر ہوکر بلکہ مجبور ہوکر اپنے صالح مقاصد کی تکمیل کے لئے

دہشت گرد تنظیموں سے پینگ بڑھانا اور تعاون لینا شروع کر دیا ہے جب کہ ان کا شعار تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ ان کی ذات سے کسی متنفس کو اذیت تو کیا پہونچتی، ان کے ذہن میں اس کا وسوسہ تک نہ گذرتا چہ جائے کہ وہ ان کے ظلم وستم کا تختۂ مشق بنے، ان کے ہاتھوں بے گناہ انسانوں کا خون پانی کی طرح بہے، امن واطمینان کی زندگی بسر کرنے والی بستیوں کو ذرا دیر میں بم کے دھماکوں سے کھنڈرات میں تبدیل کر دیا جائے، ان کی وحشت وبربریت وخونریزی سے راہ گیروں، دفتری کام کرنے والوں، ننھوں کی جانیں آبروئیں محفوظ نہ رہ سکیں، اس طرح کے اعمال وافعال کے اسباب خواہ کچھ بھی ہوں تاہم کسی بھی صورت میں اخلاق ودینی تعلیمات سے میل نہیں کھاتے، اس لئے کہ اسلام کی پاکیزہ تعلیمات، جنگ وقتال کی حالت میں بھی آداب کی رعایت اور حقوق کی پاسداری کی تلقین کرتی ہیں۔

مغربی تہذیب کا خمیر جن عناصر سے مرکب ہے وہ جرم وتشدد اور مقاصد کی تکمیل کے لئے جائز وناجائز وسائل کو اختیار کرنا ہے، خاص طور سے جرم وتشدد اس کی زندگی کا ایک اہم عنصر وحصہ بن گیا ہے، جس کا طبعی اثر یہ ہوا کہ اس مرد بیمار کی تقلید ونقالی میں بہت سی موجودہ تحریکیں بھی اسی روش پر گامزن ہیں۔

موجودہ خطرناک صورت حال سے معاشرۂ انسانی کے پورے ڈھانچے کو صرف ایک طریقہ سے بچایا جاسکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ انسانی اقدار، اخلاق کریمانہ، دینی تعلیمات کی طرف بازگشت کی دعوت دی جائے تاکہ ایک انسان اپنے انسانی تشخص ووجود کو برقرار رکھتے ہوئے پرسکون زندگی گزار سکے، وہ خود بھی محفوظ اور دوسرے بھی اس کے شر سے محفوظ رہیں، معاشرت کے آداب وقوانین سے واقف ہو، ایسا نہ ہو کہ وہ جانور کا لباس اوڑھ لے، پھر ہر ایک دوسرے سے وحشت وخوف محسوس کرنے لگے، اعتماد واعتبار بالکل پارہ پارہ ہو جائے کہ پھر نہ پڑوسی کا اپنے پڑوسی پر کوئی اعتماد ہو، نہ بچوں کا ماں باپ پر، نہ ماں باپ کا بچوں پر کوئی بھروسہ رہ جائے، ظاہر ہے جب کوئی معاشرہ اس مرحلہ تک پہونچ جائے تو کیا

اخلاق وانسانیت نام کی کوئی چیز وہاں زندہ رہ سکتی ہے۔

یورپ اس وقت اسی وبائی مرحلہ سے گذر رہا ہے، اخلاق وکردار کی ساری عمارتیں بالکل منہدم ہوگئی ہیں اور یہ حال ہوگیا ہے کہ اگر والدین کسی وجہ سے اپنے بچوں کو کچھ کہہ دیتے ہیں یا مار دیتے ہیں تو بچے اپنی مدد کے لیے پولیس کو بلوا کر ان کے ہاتھوں اپنے والدین کو زدوکوب کراتے ہیں، دیار مغرب اور اس کی تہذیب کی آغوش میں پلنے والے بچوں کا یہ حال ہے، اسی کے ساتھ ساتھ وہاں کی ماؤں کا حال بھی اس سے مختلف نہیں ہے، ان کی سنگدلی وکٹھور پن کا یہ عالم ہے کہ وہ بے محابا اپنی اولاد کو خطرات کے منہ میں جھونک دیتی ہیں، اور اپنی ادنی راحت بلکہ تفریح کو قربان کرنے کے لیے تیار نہیں، چاہے اس کی وجہ سے ان کے بچوں کی جان چلی جائے۔

یورپ کے فکری حملہ کے نتیجہ میں تیزی کے ساتھ بڑھتے ہوئے مجرمانہ رجحان کے سدّ باب کے لئے اگر وہ صالح طاقتیں جن کی بنیاد آسمانی تعلیمات وپیغامات پر ہے آگے نہیں بڑھتیں تو انسان انسانی خصوصیات کے ساتھ ناپید ہوجائے گا۔

مغرب اور دہشت گردی

یہ سچ ہے کہ مغربی سامراج نے پوری دنیا پر اپنی اجارہ داری قائم کر لی ہے، اس نے مشرقی ملکوں کے تعلیمی نظام کو بدل کر اپنے مفاد کے مطابق کیا، سماجی قدروں کو بدلا، اکثر ملکوں کی زبان بدلی، بعض ملکوں میں رسم خط بدلا، قوم کے مختلف طبقات میں نسلی عصبیتیں پیدا کر کے ان کے درمیان کشمکش پیدا کی، ایسی تہذیب کو رواج دیا جس کی بنیاد مغربی تصور اور مادی رجحان پر قائم ہے جس میں انسانی اور اخلاقی اقدار و روایات کی صرف گنجائش ہی نہیں ہے؛ بلکہ ان کو قدامت پرستی تصور کیا جاتا ہے، اس مادی تہذیب کے اثر سے ایسی تحریکیں، دعوتیں اور ایسے خیالات، افکار، نظریات اور رجحانات وجود میں آئے جو مطلوبہ اغراض و مقاصد کے حصول کے لیے ظلم و تشدد، بربریت اور سفاکی کی تلقین کرتے ہیں، اس کے سمجھنے کے لیے مغربی ادبی نظریات کا مطالعہ کافی ہے اور جو لوگ مغربی سامراج کی تاریخ سے واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ یہ عہد خون خرابہ، قتل و غارت گری، ظلم و زیادتی، سفاکی اور آزادی رائے کے سلب کرنے کا عہد تھا، ان سامراجیوں نے اپنے سامراج کے استحکام کے لیے مغلوب قوموں کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ وہ کسی پر مخفی نہیں، خود ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کے واقعات اس پر شاہد ہیں، کمزور قومیں مدت دراز تک مغربی جارحیت، ظلم و تشدد، ذلت و رسوائی اور محرومی و بدبختی کا شکار بنتی رہیں، اس جارحیت، بربریت، سفاکی اور ظلم و استبداد کو کون نہیں جانتا، جس کا مظاہرہ برطانیہ، فرانس، ہالینڈ، پرتگال، اٹلی اور سوویت یونین نے اپنی اپنی نوآبادیات میں کیا، فرانس نے تو الجزائر اور دوسرے عرب ملکوں کو اسلامی اور قومی تشخص سے محروم کرنے کے لیے ظلم و سفاکی کی ساری حدیں پار کر دیں،

سویت یونین کے ستر سالہ دور اقتدار میں انتہا پسند اور ظالم اشتراکی نظام نے ایشیا کی مسلم ریاستوں میں جو زیادتیاں اور مظالم کیے اس کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، اس انتہا پسند اشتراکی نظام نے مظلوم و مقہور قوموں پر ایسے افکار و خیالات، نظریات و تصورات اور ایسی تہذیب نافذ کی جو ان کے دین و عقیدہ کے ہی خلاف نہیں تھی؛ بلکہ ان کی قومی خصوصیات کے خلاف تھی، اس نے زندگی کا رخ بدل دیا اور ایسا نظام قبول کرنے پر مجبور کیا جو ان کی دینی غیرت و حمیت اسلامی خودداری اور عقیدہ کو قبول نہیں تھا، ان طاقتوں نے کئی بار علاقائی، ملکی اور بین الاقوامی سطح پر تنازعات اور جھگڑے پیدا کر کے اور خونریز جنگیں بھڑکا کر دنیا کا نقشہ تبدیل کر دیا اور ان خونریز جنگوں نے قوموں کو کمزور اور نڈھال کر دیا اور تہذیبوں کے اثرات و نشانات مٹا دیے، موجودہ دنیا کا نقشہ حقیقت میں سامراجی طاقتوں کا بنایا ہوا نقشہ ہے، جس میں ایک قوم کو کئی ملکوں میں بانٹا گیا ہے اور ایک قوم کے ایک چھوٹے حصہ کو دوسری قوم سے جوڑ کر کشمکش کے دائمی اسباب فراہم کیے ہیں۔

ان سامراجی طاقتوں نے معدنی، قدرتی وسائل سے مالا مال علاقوں پر ناجائز قبضہ کیا اور وہاں اپنی تہذیب عام کی تاکہ وہ ان کے کنٹرول میں باقی رہیں۔

امریکہ کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ مصیبت زدہ اور پریشان حال لوگوں کا ملجا و ماوا ہے، اس کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ وہ ایک ایسا جمہوری ملک ہے جہاں حقوق انسانی کا پاس و لحاظ رکھا جاتا ہے، اس کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ اس نے کبھی کسی ملک پر ناجائز قبضہ نہیں کیا اور نہ ہی کسی قوم کو اپنا غلام بنایا، جیسا کہ فرانس اور برطانیہ نے کیا کہ ان دونوں ملکوں نے اپنی نوآبادیات اور اپنے زیر اثر علاقوں میں عقیدہ، ثقافت اور زبان کو تبدیل کر کے قوموں کے مزاج و فطرت کو بدل دینے کی کوشش کی، لیکن ان دعوؤں کے باوجود امریکہ اعلانیہ اور کھلم کھلا پوری دنیا پر اپنا تسلط اور اقتدار قائم کرنا چاہتا ہے، ماضی میں امریکہ یہ کام دفاعی اور اقتصادی امداد کی آڑ میں کر رہا تھا، دوسری سامراجی طاقتوں کے کمزور ہونے کے بعد امریکہ نے ''نیا عالمی نظام''

کے نام سے پوری دنیا پر ایک ایسا نظام نافذ کرنے کا اعلان کردیا جس کا مرکز وسرچشمہ امریکہ ہو اور اب تعاون اور امداد کی آڑ میں اپنے زیر اثر ملکوں پر من مانی شرطیں لگانی شروع کردی ہیں اور وہ اپنا سیاسی ودفاعی نظام نافذ کررہا ہے اور ان ملکوں پر اپنا خاص تصور حیات رائج کررہا ہے، اس نے یہ نیا نظام اپنی پسند کی حکومتوں کے ذریعہ جنھیں عوامی حمایت حاصل نہیں ہے، نافذ کروانا شروع کردیا ہے جس طرح قدیم سامراجی طاقتیں تہذیبی اور اقتصادی طور پر قوموں کو مغربی تسلط کے ذریعہ اپنا تابع بنانے پر مجبور کرتی تھیں۔

امریکہ نے اپنے نظریہ اور تصور حیات کو عام کرنے کی خاطر حکومتوں کو اپنا آلہ کار بنایا ہے اور قوموں اور عوام کو یکسر نظر انداز کردیا ہے اور ان کی امنگوں، خواہشوں اور آرزوؤں سے صرف نظر کی ہے اور ان کی ضروریات زندگی اور مقاصد سے چشم پوشی کی ہے، چنانچہ جن ملکوں کے حکام اور ارباب حکومت امریکی حکام کی خواہشوں پر چلتے ہیں، وہاں کے عوام زندگی کے میدان سے الگ تھلگ ہوکر رہ گئے ہیں، ان کا اپنے ملک کی سیاست میں نہ تو کوئی دخل ہے اور نہ کوئی اثر ورسوخ، اس پالیسی کی وجہ سے حکومتوں اور سیاسی لیڈروں کے درمیان اور عوام اور عوامی قائدین کے درمیان زبردست دوری پیدا ہوگئی ہے۔

اسی کے ساتھ ساتھ امریکہ تنظیموں اور تحریکوں حتی کہ دہشت گردی، تشدد، انتہا پسندی اور جبر واکراہ کے معاملہ میں امتیازی سلوک اور دوہرے معیار کا مظاہرہ کررہا ہے، چنانچہ جو ''عمل'' اس کی مرضی کے خلاف ہوتا ہے اس کو دہشت گردی کہتا ہے اور جو ''عمل'' اس کی مرضی کے مطابق ہوتا ہے اس کو ردعمل یا دفاع یا فطری امر سے تعبیر کرتا ہے، اس امتیازی سلوک اور دوہرے معیار کا مظاہرہ اس کے اس رویہ سے ہوتا ہے جو امریکہ اسرائیل فلسطین واسرائیلی حکومت اور دوسرے ملکوں کی حکومتوں کے بارے میں زندگی کے مختلف میدانوں میں اپنائے ہوئے ہے۔

وہ تمام ظالمانہ اور دہشت گردانہ کارروائیاں جو اسرائیل عرب عوام پر کرتا رہتا ہے، وہ امریکہ کی نظر میں ملک کی سلامتی کی خاطر ہیں، انتہا پسند اسرائیلی لیڈر جو عربوں

اور فلسطینیوں کو بموں، راکٹوں اور ہتھیاروں کے ذریعہ تباہ و برباد کر دینے کی دھمکیاں دیتے رہتے ہیں اور وقتاً فوقتاً استعمال کرتے رہتے ہیں، امریکی حکام کے اندر ذرا بھی حرکت پیدا نہیں کرتے، یہاں تک کہ پناہ گزینوں کے کیمپوں میں ہزاروں بچوں اور عورتوں اور مردوں کا بہیمانہ قتل امریکہ کی نگاہ میں دہشت گردی نہیں بنا اور اگر اس کے خلاف اقوام متحدہ میں کوئی تجویز آتی ہے تو امریکہ اس کو اپنے اثر سے بے اثر کر دیتا ہے، اور اسرائیل کے خلاف آنے والی ہر تجویز کو رد کر دیتا ہے، امریکہ کا دوہرے معیار والا یہی موقف ان حکومتوں کے سلسلہ میں ہے، جو غیر جمہوری حکومتیں امریکہ کے مفاد کے مطابق کام کر رہی ہیں، امریکہ کو ان پر کوئی اعتراض نہیں ہے، بلکہ جابرانہ اقدامات کی وہ تائید کرتا ہے، اسی طرح اس کا رویہ دینی تنظیموں اور بنیاد پرست تحریکوں کے بارے میں بھی ہے جو ملک کے اندر اور ملک کے باہر تشدد، دہشت گردی اور جارحیت کا مظاہرہ کر رہی ہیں وہ اگر غیر اسلامی ہیں اور مسلمانوں کے خلاف ہیں تو وہ امریکہ کی نظر میں دہشت گرد یا خطرناک نہیں، خاص طور پر عیسائی، یہودی تحریکیں جو اسلام دشمن سرگرمیوں میں مشغول ہیں، ان کی امداد پر امریکہ کو کوئی اعتراض نہیں، دنیا کے مختلف حصوں میں مسلم تحریکوں کے خلاف جو کارروائیاں ہو رہی ہیں امریکہ ان کا مؤید ہے، اس کے مقابلے میں عیسائیوں اور یہودیوں کے خلاف کوئی معمولی واقعہ امریکہ کے غصہ کا سبب بن جاتا ہے، اس کے لیے اس نے ایک قانون بھی بنایا ہے، جو لوگ دعوت اسلامی کا کام کر رہے ہیں، دینی تعلیم عام کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، معاشرہ کی اخلاقی اصلاح کے لیے سرگرم عمل ہیں، دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ انسانی سلوک کی دعوت دیتے ہیں اور دوسرے مذاہب کا احترام بھی کرتے ہیں، تو ایسے لوگوں کی سرگرمیاں اور کوششیں امریکی حکام کی ڈکشنری میں دہشت گردی ہیں، یہی حال یورپ کے دوسرے حکام کا بھی ہے جو امریکی حکام کی ہاں میں ہاں ملا رہے ہیں اور اسلامی سرگرمیوں کے سوتوں کو خشک کر دینے کا منصوبہ بنا رہے ہیں، کیونکہ ان کی نظر میں یہ سوتے ان کے مفادات کے لیے خطرہ ہیں۔

افغانستان، عراق اور دیگر ملکوں میں امریکی کارروائی حقیقت میں کسی ایک ملک یا کسی فرد واحد کے خلاف نہیں ہے جیسا کہ میڈیا باور کرانے کی کوشش کر رہا ہے، بلکہ اسکا نشانہ ایک خاص ''رجحان'' اور مخصوص ''طرز عمل'' ہے جسے امریکہ دہشت گردی تصور کرتا ہے، دہشت گردی کی جو تشریح و توضیح کی جارہی ہے وہ صرف اسلامی فکر پر منطبق ہوتی ہے اور دہشت گردی کا خاتمہ کے نام پر جو کارروائیاں کی جارہی ہیں ان کا نشانہ بھی صرف خاص عناصر ہیں، امریکہ اور یورپ کے ممالک اعلان کر رہے ہیں کہ یہ کارروائی اسلام کے خلاف نہیں ہے؛ لیکن اپنے جو نشانے وہ بتاتے ہیں وہ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہیں، موجودہ جنگ میں جس کا ایک عرصہ سے منصوبہ بنایا جارہا تھا واشنگٹن اور نیویارک پر ہوئے حملوں سے فائدہ اٹھایا گیا، اس جنگ کی تمہیدی کارروائیاں بھی ایک زمانہ سے اسلامی بنیاد پرستی کے خاتمہ کے نام پر جاری تھیں اور اسلامی ملکوں کی حکومتوں پر زبردست دباؤ ڈالا جارہا تھا کہ وہ اسلامی رجحان کا قلع قمع کرنے کے لیے ہر قسم کی کارروائیاں کریں جس میں حقوق انسانی اور آزادی رائے اور جمہوری قدروں کی بھی کوئی رعایت نہیں تھی، چنانچہ اس دباؤ کے نتیجہ میں ترکی اور دوسرے اسلامی ملکوں میں جو امریکہ کے حکم کے تابع ہیں، دینی آزادی پر قدغن لگائی گئی، دینی مدارس بند کردیے گئے، حجاب پر پابندی عائد کردی گئی، اسلامی رجحان رکھنے والے نوجوانوں کو جیلوں میں ڈال دیا گیا، اس ذہن کے ممبران پارلیمنٹ کی رکنیت سلب کی گئی اور سیاسی حقوق سے محروم کیا گیا۔

خود امریکہ میں لاکھوں نوجوان ''خفیہ قانون'' کے تحت جیلوں میں بند ہیں، اس خفیہ قانون میں قیدی پر مقدمہ نہیں چلایا جاتا؛ بلکہ بغیر جرم ثابت ہوئے قیدی جیل میں پڑا رہتا ہے، اس پالیسی کی بنیاد پر دنیا کے دوسرے ملکوں نے بھی ایسے ہی قوانین وضوابط وضع کئے ہیں، تاکہ جسے بنیاد پرست اور دہشت گرد سمجھا جائے، اس کو گرفتار کیا جاسکے اور جن ملکوں میں ایسی کارروائیاں نہیں کی گئیں امریکہ ان ملکوں کو ایسی کارروائیاں کرنے کی تلقین کر رہا ہے بلکہ ان پر زبردست دباؤ ڈالا جارہا ہے۔

لیکن خود امریکہ بنیاد پرست تنظیموں اور دہشت گرد تحریکوں سے خالی نہیں ہے، ان میں سے متعدد مذہبی تنظیمیں تشدد کی قائل ہی نہیں؛ بلکہ اس پر عامل ہیں، لیکن امریکہ نے اپنے ملک کے اندر سرگرم بنیاد پرست اور دہشت گرد تنظیموں اور تحریکات کو نظر انداز کر رکھا ہے، جس طرح اس نے اسرائیل کی دہشت گردی و نسل پرستی سے چشم پوشی کر رکھی ہے اور دنیا کے مختلف خطوں میں اسلام اور مسلم دشمن تنظیموں اور تحریکوں کی دہشت گردی اور انتہا پسندی کو مسلسل نظر انداز کر رہا ہے۔

ابھی حال میں امریکہ کی بنیاد پرست اور دہشت گرد تنظیموں سے متعلق ایک کتاب شائع ہوئی ہے، جس کا نام ہے ''مسیح یہودی اور دنیا کا خاتمہ: سیاسی مسیحیت اور بنیاد پرستی امریکہ میں'' (المسيح اليهودي و نهاية العالم: المسيحية السياسية و الأصولية في أمريكا)، اس میں یہودیوں کے تسلط اور کٹر عیسائی تنظیموں کے سلسلے میں معلومات درج ہیں اس میں لکھا ہے کہ:

تیسرے ہزارہ کے آغاز کے ساتھ ساتھ بنیادی مذہب میں بنیاد پرستی کے احیاء کے تعلق سے دینی تشدد کی لہر دوڑ گئی ہے اور یہ لہر ریاستہائے متحدہ امریکہ کے ساحلوں تک پہنچ گئی ہے، چنانچہ ساتویں اور آٹھویں دہائی میں امریکہ میں اسقاط حمل کی ڈسپنسریوں پر حملے کئے گئے اور ان ڈاکٹروں اور نرسوں کو قتل کر دیا گیا جو اس عمل کو انجام دیتے تھے، کثرت سے بم دھماکوں کے واقعات پیش آئے، اور منظم و مسلح تنظیموں اور دینی جماعتوں نے یہ اعتقاد رکھتے ہوئے اجتماعی خودکشی کر لی، ایک جماعت کا خیال ہے کہ امریکہ ایک مسیحی ملک ہے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ سیکولر بنیادوں پر پورے عالم کی قیادت کرنے کے بجائے مسیح ثانی کی آمد کی تیاری کرے، اس مسیحی بنیاد پرستی نے مسیحی تشدد پسند جماعتوں کے کارکنوں کو لاہوتی جواز پیش کیا ہے، کہ وہ امریکی قوم کے لئے مسیحی پیغام کے احیاء کے لئے سیکولر، سیاسی اور اجتماعی نظام کے خلاف تشدد اور دہشت گردی کا راستہ اختیار کر سکتے ہیں۔

کتاب میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ مسلح بنیاد پرست مسیحی جماعتوں اور گروپوں کے اندر دو بنیادی رجحانوں میں تفریق کی جاسکتی ہے پہلے رجحان نے معاشرہ کی تبدیلی کی خاطر دینی تشدد کو مسیحی، توراتی اور دینی قدروں کی بنیادوں پر جائز قرار دیا ہے، دوسرے رجحان کو ہم ''امریکن مسیحی وطنی رجحان'' کا نام دے سکتے ہیں، یعنی امریکہ کی مسیحی شناخت کا رجحان۔

تنظیم برائے دفاعی پروگرام اور اس کے بانی پادری مائکل برا (MichaelBray) کو مسیح تشدد پسند تنظیموں کے نمونے کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے جو تشدد کے لاہوتی جواز اور اجتماعی نظریہ پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ ''آرمی آف گاڈ'' (Army of God) کی تعبیر کو امریکی میڈیا میں ۹۸-۱۹۹۷ء میں رواج ملا، چنانچہ ۱۹۹۷ء میں ایک زنانہ ڈسپنسری پر دھماکہ ہوا جہاں اسقاط حمل کا عمل انجام پاتا تھا، اسی طرح اٹلانٹا (Atlanta) میں ایک نائٹ کلب پر بم دھماکہ ہوا جہاں عورتیں جمع ہوتی تھیں اور ۱۹۹۸ء میں برمنگھم (BIRMINGHAM) میں ایک اسقاط حمل کی ڈسپنسری پر بم دھماکہ کیا گیا جس کی ''آرمی آف گاڈ'' نے ذمہ داری قبول کی۔

جو لیڈران تشدد اور دہشت گردی کو جائز قرار دیتے ہیں ان میں مسٹر رینالڈ تیپو رمان کو بھی شمار کیا جاتا ہے۔ رینالڈ تیپو رمان کا کہنا ہے کہ ''یہ ضروری ہوگیا ہے کہ امریکہ میں بنیاد پرستی اور مسیحی سیاست کو نافذ کرنے کے لئے تشدد کو جائز قرار دیا جائے۔

کرسچین رائٹسٹ (Christian Rightist) امریکہ میں بہت فعال ہیں اور وہ خالص مذہبی بنیادوں پر سماج کی تشکیل چاہتے ہیں اور وہ سیکولر نظام کے سخت مخالف ہیں اور ایک خاص ایجنڈے پر عامل ہیں جس کا پہلا مقصد سیکولر نظام کی مخالفت اور ہر اس قانون کی مخالفت ہے جو قدیم خاندانی قدروں کی مخالفت کرتا ہو اور وہ اس سلسلہ میں کسی مداخلت اور کسی پابندی کو تسلیم نہیں کرتے، ان کا ملکی داخلی سیاست میں اثر بڑھتا جارہا ہے اگرچہ انسانی اور لبرل اور سیکولر حلقے ان کی مخالفت کرتے ہیں۔ لیکن ان کے ہمنواؤں کی تعداد بڑھ رہی ہے اور آہستہ آہستہ ان کے اثرات امریکہ کی خارجی سیاست پر پڑنے لگے ہیں امریکہ نے

دوسروں کے ملکوں میں مسیحیوں کی حفاظت کا جو قانون بنایا ہے وہ اسی لابی کے دباؤ کا نتیجہ ہے۔ ان کے ہم خیال بڑی سیاسی پارٹیوں میں شامل ہیں ان کے اثرات وسائل ابلاغ پر بھی ہیں، متعدد ریڈیو اور ٹیلی ویژن اسٹیشن اس جماعت کے ذمہ داروں کے بیانات نشر کرتے ہیں۔ سی بی این (CBN) چینل جوان کا مؤید ہے ۶۰ ملکوں کے لئے چالیس زبانوں میں پروگرام نشر کرتا ہے۔

۱۹/اپریل ۱۹۹۳ء کو F.B.I. کے عملہ نے ٹکساس میں ایک عمارت کا محاصرہ کیا جس میں ڈیوڈ قورش اوران کے ۷۳ معتقد جمع تھے ان کا خیال تھا کہ قیامت آرہی ہے، آخر کار انھوں نے آگ لگا کر خودکشی کر لی۔

۱۹/اپریل ۱۹۹۵ء کو اس کی دوسری سالگرہ کے موقع پر تیوتھی مائکفی نے اوکلاہوما میں فیڈرل عمارت میں انتقامی کارروائی میں دھماکہ کیا، یہ دونوں کارروائیاں دینی کٹرپن کی وجہ سے کی گئیں۔

امریکہ کی دینی دہشت گردی اور تشدد کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کی یہ چند مثالیں ہیں، ورنہ امریکہ میں ایسی دینی جماعتیں اور تحریکات بکثرت موجود ہیں جو مسیحی رعایا کے ساتھ بدسلوکی کے الزام میں اسلامی ملکوں کے خلاف جنگ شروع کرنے کی دعوت دیتی رہتی ہیں۔ جہاں تک سیاسی اور اجتماعی تنظیموں اور تحریکوں کا تعلق ہے جو کہ سیاسی نظام سے اختلاف اور ٹکراؤ کی وجہ سے تشدد اور دہشت گردی کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔ تو ایسی تنظیموں اور تحریکوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور مشہور بھی ہیں۔ کوئی شخص اس کی تصدیق نہیں کر سکتا کہ امریکی حکومت کا انٹلی جنس اور سراغ رساں ایجنسیاں امریکہ کی بنیاد پرست تنظیموں اور دہشت گرد جماعتوں کو نہیں جانتا، جو ملک کے اندر دہشت گردی اور تشدد کا راستہ اختیار کرنے کی دعوت دے رہے ہیں، حالانکہ امریکہ اس وقت پوری دنیا میں دہشت گرد تنظیموں کا پیچھا کر رہا ہے اور ان ملکوں کو جنگ کی دھمکی دے رہا ہے جہاں اس کے تصور کے مطابق دہشت گرد تنظیمیں پناہ لیے ہوئے ہیں، اسے اپنے ملک کی دہشت گرد تنظیموں کو پہلے ختم کرنا چاہئے۔

مغربی سامراج

گزشتہ صدی کی ساتویں دہائی میں فرانسیسی نومسلم مفکر رجا جارودی نے مذہب اسلام اور اسلامی تہذیب وتمدن کے اپنے وسیع مطالعہ، انسانیت پر اسلام کے اثرات واحسانات کا جائزہ لینے اور مغربی تہذیب وتمدن کے وسیع تجربہ کے بعد لکھا تھا کہ مغربی تہذیب کی راہیں اب مسدود ہوچکی ہیں اور اس کا خاتمہ قریب ہے، رجا جارودی نے یہ بات اس وقت کہی تھی جبکہ پوری دنیا مشرقی اور مغربی یورپ کے زیر نگیں تھی اور اس کے سرمایہ دارانہ اور اشتراکی نظام کا دور دورہ تھا اور دو عظیم براعظم ایشیا اور افریقہ کے ممالک ان دو نظاموں کے ماتحت تھے، اس صورت حال میں رجا جارودی کی یہ پیشن گوئی بلکہ حقیقت بیانی غیر معقول اور مضحکہ خیز معلوم ہوتی تھی، جس طرح دوسری جنگ عظیم سے قبل سامراج کا سقوط ناقابل یقین معلوم ہوتا تھا، اسی وجہ سے فرانس، برطانیہ اور ہالینڈ جیسی عظیم سامراجی طاقتوں کے پنجۂ استبداد سے آزادی وگلوخلاصی کی خاطر جدوجہد کرنے والوں کی قربانیوں اور جانفشانیوں کی حقیقت حکمراں سامراجی طاقتوں پر فریفتہ اور مرعوب افراد کی نگاہوں میں خواب وخیال سے زیادہ کچھ اور نہ تھی، مغربی سامراجی طاقتوں کے زیر اثر قائم ہونے والی دانش گاہوں اور مغربی نصاب ونظام تعلیم کے پروردہ اور روشن خیال افراد آزادی کے ان متوالوں کی سرفروشانہ جدوجہد، قربانی اور جانثاری کا مذاق اڑا رہے تھے اور مغربی تمدن سے ان کی مرعوبیت کا یہ حال تھا کہ مغرب کی ہر چیز کو مقدس، منزل من السماء اور نقد وتبصرہ سے بالاتر اور سامراجی طاقتوں کو ناقابل تسخیر سمجھ رہے تھے۔

فرانس نے الجزائر کو اپنی مملکت میں شامل کرلینے اور اس کی عربی واسلامی شناخت

کوختم کردینے اور ماضی سے اس کا رشتہ کاٹ دینے کی بھرپور کوشش کی، روس نے اپنے زیر کنٹرول مسلم اکثریت والے ملکوں کے دینی واسلامی تشخص کو مٹا دینے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، اور اس کی تہذیبی اور تاریخی شناخت کو ملیامیٹ کرنے کے لئے ذرائع نشر واشاعت، سیاست، اقتصاد ومعاش اور تعلیم وتربیت کے سارے وسائل اختیار کئے، تاکہ یہاں کے مسلمانوں کا دینی تشخص اور اسلامی شناخت کلی طور پر ختم ہوجائے، اور اسلامی وجود کے سارے سوتے خشک ہوجائیں، اور روسی سماج کے رنگ میں رنگ جائیں، لیکن معاصر تاریخ اس بات کی شاہد عدل ہے، کہ سامراجی طاقتوں کی یہ ظالمانہ اور جبری کوششیں بارآور نہ ہوسکیں، اور مسلمان اپنے دینی تشخص اور اسلامی شناخت اور عقیدہ کو بچانے میں کامیاب رہے۔

سویت یونین نے افغانستان پر قبضہ کرنے کے لئے دس سال تک ظالمانہ کوششیں جاری رکھیں، لیکن کامیاب نہ ہوسکا، بلکہ یہ کوششیں اس کے تابوت کی آخری کیل ثابت ہوئیں اور افغانستان اس کا قبرستان بن گیا، اور یہ عظیم اتحاد ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گیا، اور نہ صرف سیاسی زوال ہوا بلکہ اشتراکیت کا ڈھانچہ بھی ڈہ گیا، اشتراکی فکر ونظر کے خلاف بغاوت پھوٹ پڑی اور اشتراکیت کے آہنی وفلک بوس قلعہ کے زمیں بوس ہوتے ہی سویت یونین کے تابع فرمان ممالک باغی ہوگئے، اور اہل نظر کے سامنے اشتراکیت جس کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا، اس کی حقیقت آشکارا ہوگئی۔

یورپی طاقت کا دوسرا بلاک (سرمایہ دارانہ نظام) امریکہ کی قیادت میں باقی رہا جو اشتراکی قلعہ مسمار ہونے کے بعد سپر پاور بن گیا، اور دیگر یورپی طاقتیں اس کی حلیف بن گئیں، اس بلاک کی بھی اولین ترجیحات میں ان ممالک پر قبضہ کرنا تھا جو سیاسی، یا فکری، یا دفاعی طور پر سویت یونین کے تابع تھیں، لہٰذا ان ملکوں کو نشانہ بنایا اور زندگی کے تمام میدانوں میں ان کو زیر اور بے دست وپا کرنے کی کوششیں کیں، ان ممالک میں پہلا نشانہ افغانستان تھا جو سویت یونین کے زیر اثر رہا اور یہاں اشتراکی نظام کا غلبہ رہا، اور پھر عراق نشانہ بنا جہاں پچاس سالوں تک اشتراکی نظام کی بالادستی رہی، لیکن جن ملکوں نے بدلتے

ہوئے حالات کو سمجھ لیا انہوں نے اپنے کو بچالیا اور اپنی وفاداریاں ابھرتی ہوئی نئی طاقت سے وابستہ کرلیں جس کی وجہ سے وہ سپر پاور کی علانیہ عسکری مار سے محفوظ رہے اور مختلف بہانوں سے لگائی جانے والی پابندیوں سے بچ گئے۔

سیاسی مقاصد کو بروئے کار لانے کے لئے دنیا کے ذخائر اور معدنیات پر قبضہ کرنے کی خاطر نیو ورلڈ آرڈر کی تشکیل کے عنوان سے یورپ نے امریکہ کی قیادت میں اپنی جنگ کا رخ کمیونزم سے پھیر کر اسلام اور اسکے سوتوں کی طرف کردیا، اور ''اسلامی خطرہ'' کی آڑ میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جنگ چھیڑ دی، لہذا سیاسی تبدیلی کے ساتھ ساتھ فکر ونظر میں بھی تبدیلی آئی۔

کمیونزم اور اس کے قلعوں سے جنگ محدود جنگ تھی، لیکن اسلام کے خلاف جنگ عالمی جنگ ہے، کیونکہ اسلام اور مسلمان پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں، چاہے اقلیت میں ہوں یا اکثریت میں، اور پھر کمیونزم نظریہ اور عقیدۂ اسلام اور اشتراکی نظام اور اسلامی نظام دونوں میں بڑا بین فرق ہے۔

مغرب کے بعض مفکرین اور قائدین نے اس فرق کو سمجھ لیا ہے کہ جبر وقہر، ظلم وجور اور جارحیت وبربریت سے جہاں ایک طرف کمیونزم کا قلعہ مسمار ہورہا تھا اور اشتراکیت کا جنازہ نکل رہا تھا، وہیں دوسری طرف عقیدۂ اسلامی کے پیروکاروں کے اندر پامردی وثابت قدمی، قربانی وجانثاری اور فدویت وفنائیت کے جذبات پیدا ہورہے تھے۔ موجودہ زمانہ میں اسلام کے ساتھ جبر وقہر اور ظلم وعناد کا رویہ اس کا کھلا ثبوت ہے، اور قدیم وجدید تاریخ بھی اس کی گواہ ہے، چنانچہ افغان مجاہدین نے سویت یونین کے چھکے چھڑادئے، اور سویت یونین لاکھ جتن کے باوجود کامیاب نہ ہوسکا، اور آج بھی افغان سپر پاور کے راہ میں ناقابل تسخیر روڑا بنے ہوئے ہیں، افغان مزاحمین اور حلیف فوجوں کے کا خاصا جانی ومالی نقصان ہورہا ہے، اسی طرح فرانس نے الجزائر کو اپنی مملکت کا حصہ بنانا چاہا لیکن جانباز جزائری قوم نے زبردست جانی ومالی نقصان کے باوجود فرانس کو اپنے سامراجی منصوبہ میں کامیاب نہ

ہونے دیا جس کے نتیجہ میں الجزائر کی اسلامیت اور عربیت محفوظ رہی۔

مغربی سامراج کی تاریخ نئے سامراجیوں کے لئے تازیانۂ عبرت ہے، جو قوموں کو غلام بنانے کی اپنی قدیم ناکام سیاست کا ایک بار پھر تجربہ کررہے ہیں، اس کی بہترین دلیل یہ ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف عالمی جنگ کے باوجود پوری دنیا میں خصوصاً یورپی ممالک میں اسلام کی مقبولیت روز افزوں ہے، بلکہ اسلامی لہر چل پڑی ہے، معاندین اسلام میں اسلام کے مطالعہ کا رجحان بڑھ رہا ہے اور بڑی تعداد میں اسلام قبول کررہے ہیں، یورپین ممالک میں مساجد، مدارس اور اسلامک سنٹرز قائم ہورہے ہیں، جگہ جگہ اسلامی ثقافت کے مظاہر نظر آنے لگے ہیں، داڑھی، پردہ، اسکارف اور ساتر اور باوقار لباس کا چلن عام ہوگیا ہے۔

اسلامی تاریخ کے یہ حقائق اور مسلمانوں کی یہ مزاجی کیفیات وخصوصیات اور طبیعت یورپ سے متقاضی ہے کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے تئیں اپنی روش اور طرز عمل میں تبدیلی لائے، ورنہ موجودہ عالمی اقتصادی بحران جس سے امریکہ اور یورپ دوچار ہیں، اس سے زیادہ کسی سنگین انسانی المیہ یا انسانی ٹریجڈی سے دوچار ہوسکتے ہیں جس کے آثار ظاہر ہونے لگے ہیں، آج ساری دنیا یورپین ممالک کی جانب سے انسداد اسلامی دہشت گردی کے نام سے کی جانے والی ظالمانہ اور جابرانہ کارروائیوں کی وجہ سے بدامنی، خوف وہراس اور فتنہ وفساد کی آماجگاہ بن گئی ہے۔

یورپ علم وحکمت اور حالات کے اعتبار سے طرز عمل تبدیل کرلینے میں مشہور ہے، یہ اس کا امتیاز سمجھا جاتا ہے اور اس نے علم وثقافت کے باب میں یہ موقف اختیار بھی کیا ہے، یورپ جمود وتعطل اور تقلید کا قائل نہیں، اس کی تہذیب کی اساس ہی تجدد اور واقعیت پسندی پر ہے، اور یہ تبدیلی، حقیقت پسندی اور بقائے انفع کے اصول پر یقین رکھتا ہے، اس نے ماضی میں کئی بار حالات کے اعتبار سے اپنے موقف اور روش میں تبدیلی کی ہے، اور یہی تہذیب حاضر کی پہچان ہے، لیکن اس کے برعکس وہ اسلام اور مسلمانوں کے تئیں جمود، ہٹ

دھرمی اور کورانہ تقلید کے موقف پر قائم ہے، اور قرون مظلمہ میں ان کے اسلاف نے جس روش کو اختیار کیا تھا آج یورپ کے قائدین اسی پر عمل پیرا ہیں، اسلام کے احسانات اور اس کے مآخذ سے استفادہ کا انکار کر رہے ہیں، اور اسلام اور اس کے مقدسات پر حملے کر رہے ہیں۔

اسلامی مقدسات خصوصاً شان رسالت اور قرآن مجید کے سلسلہ میں گستاخی اور اہانت کا سلسلہ ہنوز جاری ہے، اور قدیم من گھڑت مقولہ ''اسلام تشدد اور تلوار کا مذہب ہے'' بدستور رٹے رٹائے طوطہ کی طرح دہرایا جا رہا ہے، یہ روش طفلانہ اور بچکانہ حرکت معلوم ہوتی ہے، جس سے صورت حال بدلنے والی نہیں، بلکہ اس سے مسلمانوں کے اندر ردعمل پیدا ہو رہا ہے، مختلف قوموں کے درمیان ٹکراؤ اور کشیدگی پیدا ہو رہی ہے اور اور امن وامان کی صورت بگڑتی جا رہی ہے۔ دوسری جانب یہی معاندانہ رویہ اسلام اور اسلامی تاریخ کے مطالعہ اور قبول اسلام کا سبب بھی بن رہا ہے، اور یہ حقیقت ہے کہ آج یورپ میں اسلام جس تیز رفتاری سے پھیل رہا ہے ماضی میں اس کی نظیر نہیں ملتی، حالانکہ پورا یورپ اسلام کے خلاف کیل کانٹے سے لیس ہو کر برسر پیکار ہے۔

موجودہ حالات کا تقاضہ ہے کہ یورپ میں اسلام کے مطالعہ کی طرف توجہ کی جائے اور اس سلسلہ میں کوششیں تیز سے تیز تر کی جائیں اور اسلام کا یہ مطالعہ صاف، کھلے ذہن، عصبیت سے بالاتر ہو کر کیا جائے، نیز زیر مطالعہ تحریریں ان قلم کاروں کے اثرات سے پاک ہوں جن کی تعلیم وتربیت قرون وسطی میں عیسائی مشنریوں کی نگرانی میں ہوئی تھی جو اسلام کی حقانیت کے سامنے شکست خوردگی کا شکار تھے، یہ موقف صاحب ثروت کے سامنے محنت کش یا زندگی کی لذتوں سے محروم شخص کا ہے، اشتراکیت مالداروں اور زمین داروں کے خلاف ردعمل کے طور پر وجود میں آئی اور غریب مزدوروں کا خوب استحصال کیا، اور انہی کی حمایت اور تائید پر اپنے خوابوں کا شیش محل تعمیر کیا، لیکن جب سواد اعظم کو حقیقت کا پتہ چلا اور اپنے استحصال کا احساس ہوا تو اشتراکیت کا یہ شیش محل چکنا چور ہو گیا، لہٰذا اسی طرح اسلام کے خلاف عیسائی مشنری نے جو عمارت بنائی ہے وہ بھی عنقریب گر جائے گی

جب حقیقت آشکارا ہوگی، اس لئے کہ مکر وفریب اور مکاری وعیاری کو دوام نہیں ہوتا۔

مغرب اپنے عہد سامراج میں اس طرز عمل کا خوب تجربہ کر چکا ہے، اور آج ایک بار پھر اسلام مخالف جنگ میں اس کا تجربہ کر رہا ہے جس میں اسلام کو امن عالم کے لئے ایک عظیم خطرہ کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے، اور وہ سارے وسائل اور حربے استعمال کئے جا رہے ہیں جو قدیم سامراج نے استعمال کئے تھے، لیکن جس طرح ماضی میں یہ وسائل کمزور قوموں کو زیادہ دنوں تک غلامی میں رکھنے میں کارگر نہیں ہو سکے اسی طرح موجودہ جنگ اور سامراجی تسلط اور غلبہ کی بقا میں ناکام اور نامراد ثابت ہوں گے۔

متعدد اسلامی تنظیمیں اور مسلم قائدین افہام وتفہیم، ڈائلاگ، مذاکرات، ملاقات اور پرامن کوششوں کی راہ سے اس روش کو بدلنے کے لئے کوشاں ہیں، لیکن یورپ کی انتہا پسند اور متشدد عیسائی جماعتوں اور کلیسا سے تعلق رکھنے والے سیاسی قائدین ان کوششوں کو ناکام بنانے کے درپے ہیں، یہ ایسے بیانات دیتے یا اقدامات کرتے رہتے ہیں جن سے مسلمانوں میں رد عمل پیدا ہو جاتا ہے، اسی طرح کلیسا کا بھی رویہ جمود اور انکار کا ہے، اور بعض مغربی اہل قلم بغیر سمجھے بوجھے ان باتوں کو دہراتے رہتے ہیں جو صلیبی عہد کی پیداوار ہے، جس کی وجہ سے انسانیت کی پریشانیاں بدستور جاری ہیں، اور المناک واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں، جن سے دنیا کا امن وسکون غارت ہوتا رہتا ہے، یہ المناک صورت حال اسی وقت تبدیل ہو سکتی ہے جب فریقین کے موقف میں تبدیلی ہو اور جانبین علم وحکمت اور انسانی مفاد کو ترجیح دیں۔

کسی بھی تہذیب وتمدن کے بنیادی عناصر باہمی تعاون، مفاہمت، تبادلۂ خیال، آپسی اتحاد واتفاق، یگانگت ویکجہتی، رواداری اور الفت ومحبت ہوتے ہیں، لہٰذا جب کسی تہذیب سے یہ بنیادی عناصر ختم ہو جائیں اور وہ اپنی امتیازی خصوصیات سے تہی دست ہو جائے تو یہ تہذیب کسی بھی صورت میں روئے زمین پر باقی نہیں رہ سکتی، چاہے اس کے پاس کتنے ہی عظیم اور طاقتور وسائل ہوں۔

یورپ کے اپنے مسائل

مغربی تہذیب وتمدن کی ترقی اور بالادستی، مغرب کے سیاسی غلبہ اور اس کے نظام تعلیم وتربیت کی وجہ سے ناقابل زوال اور ناقابل تنقید نظر آتی ہے اور سمجھا جاتا ہے کہ یورپ اپنے مسائل حل کرنے کے بعد پوری دنیا کی قیادت کی قوت وصلاحیت رکھتا ہے، لیکن اگر یورپ کی سیاسی، معاشی اور سماجی حالت کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا جائے تو ایسی تصویر سامنے نہیں آتی ہے جس سے مستقبل کے بارے میں کچھ نیک توقعات وابستہ کی جاسکیں؛ بلکہ جو تصویر سامنے آتی ہے وہ مشرق کی تصویر سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔

جن ملکوں پر یورپ کے اثرات زیادہ غالب رہے ہیں وہاں ذاتی مفاد اور مصیبت کی وجہ سے ظلم وستم اور حق تلفی عام ہورہی ہے، علاقائیت اور قومیت کی بنیاد پر عداوتیں پروان چڑھ رہی ہیں، رنگ ونسل اور زبان وتہذیب کے جھگڑے رونما ہورہے ہیں، اور کمزور طاقتور کے ظلم وتشدد کا تختۂ مشق بنا ہوا ہے، مظلوموں اور اقلیتوں کا زبردست استحصال ہورہا ہے۔ اس جاہلیت کے آثار زندگی کے ہر میدان میں ظاہر ہورہے ہیں۔ اور وہ نظام زندگی ختم ہوتا جارہا ہے، جس میں انسان اخلاقی اور سماجی زندگی گزارتا تھا، جس سے اجتماعی مزاج بنتا تھا۔ دنیا کے ہر حصے میں آج امتیاز وتفریق کے اسباب ومحرکات سر اٹھا رہے ہیں، پوری دنیا میں کشمکش، تفرقہ اندازی اور باہمی جھگڑوں کا دور دورہ ہے اور کوئی بھی ایسی طاقت نہیں ہے، جو ان پر کنٹرول کرسکے اور قابو پاسکے۔

علاقائیت اور قومیت کی بنیاد پر دنیا تقسیم ہوتی جارہی ہے، جس کے نتیجہ میں ایک ہی ملک مختلف ملکوں میں تقسیم ہورہا ہے، اور ایک ہی قوم کے مختلف عناصر آپس میں جنگ وجدال

پر آمادہ ہیں، اس میں مذہبی اور فکری عصبیت بھی سیاسی انداز سے شامل ہوگئی ہے اور اپنے مقصد کے حصول کے لئے طاقت کا استعمال عام ہورہا ہے، افہام وتفہیم، تحمل اور رواداری کا دائرہ تنگ ہوتا جارہا ہے، یہ سارے اسباب ووسائل مغرب کی تحریکوں سے ماخوذ ہیں۔

سوویت یونین کے بکھرنے کے بعد کمیونسٹ اتحاد زوال پذیر ہوگیا جو مغربی یورپ کے استحصال کی راہ میں رکاوٹ تھا۔ لیکن اس کی وجہ سے دنیا دو بڑے نظاموں میں بٹی ہوئی تھی، دونوں نظاموں نے اپنی حفاظت کے لئے اسلحہ سازی اور جاسوسی، اور تخریبی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور پوری دنیا میں کشمکش اور انتہا پسندی کی فضا قائم کردی، ان دونوں بلاکوں میں جو ممالک شامل تھے وہ آپس میں ایک دوسرے کے حلیف تھے، اور دوسرے بلاک کے دشمن اور بدخواہ تھے، یہ سارے ممالک جو کسی نہ کسی بلاک سے وابستہ تھے اور جن کے مفادات مشترک تھے، اور جن کی داخلی وخارجی سلامتی محفوظ تھی، الگ ہونے کے بعد نئی تفرقہ اندازی، آپسی پھوٹ اور داخلی انتشار وخلفشار اور انارکی سے دوچار ہیں، اب ہر بلاک مختلف بلاکوں میں منقسم ہوگیا ہے، اور اندرونی کشمکش میں مزید اضافہ ہوگیا ہے اور دوسرے ملکوں میں انتشار اور کشمکش پیدا کرنے کو اپنی سلامتی اور ترقی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

ان انسانی، تہذیبی، تجارتی، تعلیمی اور دینی امتیازات، رنگ ونسل، علاقائیت اور قومیت کے جھگڑوں اور تعصبی رجحانات کا ہر وہ شخص مشاہدہ کرسکتا ہے جو موجودہ دور کے حالات سے واقفیت رکھتا ہے، وہ کسی ایک ملک کے مختلف طبقات وعناصر سے اگر تبادلۂ خیال کرے تو دیکھے گا کہ ایک ملک کے باشندے الگ الگ دائروں میں گردش کررہے ہیں، اور وہ زبان، تہذیب وثقافت، رنگ ونسل، دفاعی قوت اور تجارت ومعیشت کی بنیاد پر مختلف حلقوں اور طبقوں میں بٹے ہوئے ہیں، یہ اختلافات وامتیازات مشرق اور مغرب دونوں حلقوں میں پائے جاتے ہیں، جن سے خود یورپ اور ترقی یافتہ ملک محفوظ نہیں، جو کچھ سابق یوگوسلاویہ، البانیہ، مقدونیہ، انڈونیشیا، ایتھوپیا، سوڈان اور صومالیہ میں واقع ہوا، اور

تونس، لیبیا، عراق، مصر اور شام میں اگر کشمکش ہے، تو برطانیہ اور یورپ کے کئی ملکوں میں بھی قومی، نسلی رجحانات بڑھ رہے ہیں، ان رجحانات کا سبب یورپ کا وہ موقف ہے جو اس نے اپنے سیاسی اور اجتماعی مفادات کی وجہ سے اپنایا ہے، اور آزادی اور مقصد کے حصول کے لیے ہر قسم کے وسائل کے استعمال کا نظریہ ہے، اب یہ کشمکش خود یوروپین ممالک اور امریکہ میں جنم لے رہی ہے۔

جو لوگ مغربی دنیا کے حالات پر نظر رکھتے ہیں وہ بخوبی جانتے ہیں کہ یورپ کے مختلف ملکوں میں قومی و نسلی عصبیت کے رجحانات بڑھ رہے ہیں، یہ قدیم سامراجی ممالک ہیں اور ہر ملک کے الگ الگ مفادات ہیں اور اپنے اپنے ذاتی مفادات و اغراض کے حصول کے لئے ان میں ریس جاری ہے، یہی قومی مفادات کا اختلاف ماضی میں کئی جنگوں کا سبب بن چکا ہے، اور آج پھر قومی اغراض و مفادات کی خاطر پوری دنیا میں انتشار و خلفشار اور انارکی پھیلتی جارہی ہے، بڑے ممالک جو مالی اور دفاعی مدد دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں، وہ چھوٹے ممالک کے تئیں جو ان کی مدد کے محتاج ہیں، معاندانہ رویہ رکھتے ہیں۔

یورپ کو یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ افتراق و انتشار اور اختلاف و خلفشار کے یہ بیج اس کے خود بوئے ہوئے ہیں، وہ یہ بھی جانتا ہے کہ یہ اختلافات ماضی میں خون خرابے کا سبب بن چکے ہیں۔

یورپ میں ان سیاسی، اقتصادی، تہذیبی اور نسلی جھگڑوں کے ساتھ ساتھ عیسائی بنیاد پرستوں کا ایک طاقتور عنصر بھی سرگرم عمل ہے اس عنصر کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اور یہ عنصر امریکا، جرمنی، برطانیہ، فرانس، اٹلی اور اسپین بلکہ ہر یورپین ملک میں زبردست قوت اور اثر و رسوخ کا حامل ہے۔ یورپ اس عنصر کو اسلام اور مسلمانوں سے جنگ کرنے کے لئے استعمال کرتا رہا ہے اور اس کے لئے ہر ممکن وسائل فراہم کرتا رہا ہے۔ تاکہ وہ خارجی دنیا میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھ سکے، لیکن جو ادارے عیسائی مشنریاں تیار کرتے تھے اب

وہ بھی بنیاد پرستی کی تعلیم دے رہے ہیں اور اب ایک ایسی طاقت کے ظہور کے آثار نمایاں ہونے لگے ہیں جو سیاسی قیادت سے متصادم ہوسکتی ہے، نوجوانوں میں اپنی پیاس بجھانے، نفس کو تسکین بخشنے اور شور شرابہ والی زندگی سے اکتا جانے اور بے چینی کا علاج کرنے کی غرض سے قلبی سکون حاصل کرنے کے ذرائع حاصل کرنے کا رجحان بڑھنے لگا ہے، اور جوں جوں مشرقی مذاہب وادیان کا اثر ورسوخ بڑھ رہا ہے، یہ رجحان بھی بڑھتا جارہا ہے، اس کی علامتیں اکثر ظاہر ہوتی رہتی ہیں۔

کچھ عرصہ پہلے ایک انتہا پسند مذہبی گروہ نے امریکہ میں حکومت کو چیلنج کیا اور پھر خودکشی کرلی، اس طرح کی فکر کے حامل گروہ یورپ کے ہر ملک میں پائے جاتے ہیں، یورپ میں ایسے نوجوانوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جن میں مادیت کے خلاف ردعمل پیدا ہورہا ہے، اسلامی بنیاد پرستی کے خطرہ کو بڑھا چڑھا کر پیش کئے جانے سے اس میں اضافہ ہورہا ہے۔

یورپ میں باہمی کشمکش کے بہت سے اسباب ہیں، ان میں سے ایک سبب یہودیوں کا زندگی کے تمام شعبوں پر غلبہ ہے جس سے غیر یہودی حلقوں میں بے چینی اور سخت ردعمل پیدا ہونا شروع ہوگیا ہے اور اس یہودی لابی کے تسلط واقتدار سے نجات پانے کے آثار محسوس کیے جارہے ہیں۔

اس کے علاوہ یورپ میں سیاہ فام اور سفید فام نسلوں کے درمیان زبردست کشمکش بڑھ رہی ہے، دوسری طرف یورپ میں پوری دنیا پر امریکی تسلط کے خلاف ردعمل شروع ہوگیا ہے، امریکہ سے مدد لینے والے ملک بھی امریکی بالادستی کو ناپسند کرتے ہیں۔

جب سے مشرقی ملکوں میں یورپی سامراج کا آغاز ہوا ہے تب سے یورپ اپنے ملک کی خامیوں، برائیوں اور کمزوریوں سے چشم پوشی، اور دوسرے ملکوں کے عیوب ونقائص کی جستجو وتلاش کا عادی ہوگیا ہے، چنانچہ کوئی بھی مبصر یا تجزیہ نگار یورپ کی موجودہ تہذیب

وتمدن کی برائیوں اور خامیوں پر، اور یورپ اس وقت جن داخلی خطرات سے دوچار ہے ان پر ذرا بھی لب کشائی نہیں کرتا ہے، اور نہ ہی کوئی تبصرہ کرتا ہے بلکہ اپنی تمام تر توجہ خارجی دنیا پر مرکوز رکھتا ہے جس کا نتیجہ ہے کہ اندرونی بیماریاں بڑھتی جارہی ہیں اور اس کی طرف کسی کی توجہ نہیں ہے۔

یورپی تہذیب وتمدن کی بنیاد ہی زندگی کے متعین اصول وضوابط اور روایات واقدار کے خلاف بغاوت پر ہے، مذہبی روایات واقدار کے خلاف بغاوت کے نتیجہ میں وہاں دو رجحان پیدا ہوگئے ہیں، نوجوانوں کا ایک گروہ ایسا ہے جو رہبانیت کی زندگی گزارنا چاہتا ہے۔

دوسرا گروہ وہ ہے جو ایسی زندگی گزارنا چاہتا ہے، جس میں ہر طرح کی آزادی ہو، اور دینی روایات واقدار کا پاس ولحاظ نہ کرنا پڑے، اس طرح یورپین معاشرہ میں کھلا تضاد پایا جارہا ہے، اس کے افراد بلاتفریق مرد وعورت جانوروں جیسی زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔

اس طرح کے بہت سے نوجوان اپنی تہذیب وتمدن اور ثقافت سے بغاوت کر کے مشرقی ملکوں کا سفر کررہے ہیں اور عبادت گاہوں یا قہوہ خانوں اور فحاشی کے اڈوں میں زندگی بسر کررہے ہیں، اس طرح کے مناظر کوئی ڈھکے چھپے نہیں ہیں، بلکہ ہر بڑے شہر میں اسکا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے، اور نوجوانوں کا ایک گروہ ایسا بھی ہے جو چوری، ڈکیتی اور قتل وغارت گری جیسے سنگین جرائم میں ملوث ہے، نوجوانوں کا یہ گروہ مالداروں کو یرغمال بنالیتا ہے اور مطالبات پورے نہ ہونے کی صورت میں ان کو قتل کردیتا ہے، امریکہ اور فرانس کے اندر نوجوانوں میں جرائم کا رجحان اتنا بڑھ گیا ہے کہ گھومنے پھرنے پر پابندی عائد ہے، عافیت پسند لوگ گھروں سے باہر نکلنے سے گھبراتے ہیں، عورتوں اور کم سن بچوں پر مظالم عام ہیں۔

مادی اور عسکری طاقت وقوت یورپ کا وہ آخری حربہ ہے جس سے یورپ اپنا ہولناک اور گھناؤنا چہرہ چھپائے ہوئے ہے، اور مادی وعسکری طاقت وقوت کے ہی ذریعہ ان رجحانات اور خطرات پر پردہ ڈال رکھا ہے جو اس کے وجود کے لئے خطرہ پیدا کررہے

ہیں لیکن نوجوانوں کا جرائم کا عادی ہوجانا اور قتل وغارت گری اور تخریبی اعمال سے لذت اندوز ہونا یہ وہ چیزیں ہیں جن سے ثابت ہوجاتا ہے کہ یورپ امن وسلامتی اور خوشحال زندگی کے حصول میں بری طرح ناکام ہوگیا ہے، اور یہ بھی ثابت ہوجاتا ہے کہ یورپ اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق عالمی مسائل حل کرنے میں ناکام ہوگیا ہے۔

بہت سے عالمی مسائل کے حل کرانے میں ناکام ہوجانے کی وجہ سے اور باہم دست وگریباں طاقتوں کو ظلم وتشدد سے باز رکھنے میں بے بس اور ناکام ہوجانے کی وجہ سے یورپ کا پوری دنیا پر جو رعب ودبدبہ تھا ختم ہوتا جارہا ہے، جب یہ متفرق عناصر متحد ہوکر طاقتور ہوجائیں گے تو عسکری طاقت وقوت یورپ کو بچا نہیں پائے گی جیسا کہ یہ عسکری طاقت وقوت سوویت یونین کو بچانے میں ناکام رہی ہے۔

ریاستہائے متحدہ امریکہ میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں اور امریکی جرائم کے متعلق کویت سے نکلنے والے ہفت روزہ عربی میگزین "المجتمع" میں ایک رپورٹ شائع ہوئی تھی، اس کے کچھ اہم اعداد وشمار پیش کرتے ہیں تاکہ یورپی تہذیب وتمدن سے جو لوگ مرعوب ومسحور ہیں اور امریکہ کی ترقی کا راگ الاپتے رہتے ہیں، وہ اندازہ کرسکیں کہ ان کا محبوب وممدوح امریکہ انسانی حقوق کی پامالی اور جرائم کے ارتکاب میں کہاں تک پہنچ گیا ہے۔

۳۲ ملین امریکی خط افلاس سے نیچے زندگی بسر کررہے ہیں، ۱۲ ملین ایسے ہیں جن کے رہنے سہنے اور کھانے پینے کا کوئی ٹھکانہ نہیں، کوئی نظم نہیں، ۲۱ ملین ناخواندہ ہیں، پڑھنا لکھنا بالکل نہیں جانتے، صرف پچاس ملین امریکیوں کو ووٹ دینے کا حق ہے، جب کہ امریکہ کی مجموعی آبادی ۲۰۵ ملین ہے، امریکی صدر کے عہدہ پر فائز ہونے کا حق صرف مالداروں کو ہے، انسانی حقوق کی کھلے عام پامالی ہورہی ہے کہ ایک ملین بچوں کا کوئی پرسان حال نہیں، ایک ملین امریکی بچے ملک سے باہر دربدر کی ٹھوکریں کھارہے ہیں، اور ۱۳ ملین بچے خط افلاس سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں، اور ہر سال پانچ ہزار بچے قتل کئے جاتے ہیں

جو گروہ عورتوں اور بچوں کو یرغمال کر کے امریکہ لے جاتے ہیں، وہ سالانہ سات عرب ڈالر کماتے ہیں، تازہ اعداد و شمار کے مطابق امریکہ میں ۲۰۰ ملین پرائیویٹ اسلحہ سیکٹر ہیں جب کہ ایک لاکھ سے زائد اسلحہ بیچنے والی رجسٹرڈ دکانیں ہیں، ایک امریکی ایجنسی کی سالانہ رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک سال میں ستر ہزار اسلحہ استعمال ہوتے ہیں، ان میں سے ۵۰ ہزار کا استعمال غیر ملکیوں پر حملہ کرنے میں ہوتا ہے اور باقی چوری، ڈاکہ زنی، اور قتل و غارت گری جیسے جرائم میں ہوتا ہے۔

روس، فرانس اور اسپین میں جرائم کا تناسب اس سے کہیں زیادہ ہے، اس کے علاوہ اخلاقی قدروں کی پامالی، ظلم و ستم قومی سطح پر ہو یا انفرادی زندگی میں وہ خدا کے عذاب کو دعوت دینے والا عمل ہے اور اس سے کم تناسب پر پیش آنے والے واقعات ماضی میں کئی قوموں کی مکمل تباہی کا سبب بن چکے ہیں جو تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں، سب سے سنگین بات یہ ہے کہ ان بداعمالیوں کو قانونی حیثیت دے دی گئی ہے اور اس کی مخالفت کو قانون شکنی اور خلاف تہذیب سمجھا جاتا ہے۔

یورپ کے اتحاد اور بقا کے لیے دشمن کا تصور ضروری ہے

گیارہویں صدی میں جب یورپ انتشار اور پسماندگی کا شکار تھا، اقتصادی اور سیاسی بدامنی اور افراتفری کا دور دورہ تھا، اسلام کے خلاف صلیبی جنگ کا سلسلہ چھیڑ کر اپنے کو متحد کرنے اور جمود دور کرنے کی کوشش کی، ان جنگوں سے یورپ کو کوئی نمایاں فائدہ تو حاصل نہ ہوسکا، لیکن بیداری کا جذبہ پیدا ہوا، ان جنگوں نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو نفرت پیدا کی وہ نسل در نسل منتقل ہوتی رہی، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ صلیبی جنگوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''سلجوقی سلطنت کے زوال اور اسلامی سلطنت کی شمالی سرحدوں کی کمزوری کی وجہ سے یورپ میں قسمت آزمائی کا خیال پیدا ہوا، اسی عرصہ میں اس کو راہب پطرس کی صورت میں ایسا خطیب مل گیا، جس نے ساری مسیحی دنیا میں اپنی آتش نوائیوں سے آگ لگادی، اور ایک سرے سے دوسرے سرے تک مذہبی جنون کی لہر پیدا کردی، اس کے علاوہ وسیع وزرخیز اسلامی مملکت پر حملہ کرنے کے اور بھی متعدد سیاسی ومعاشی اسباب ومحرکات جمع ہوگئے جنھوں نے صلیبی حملوں میں دینی ودنیاوی کشش اور ترغیب پیدا کردی''۔
>
> (تاریخ دعوت وعزیمت، جلد اول، صفحہ: ۲۵۳)

اس کے بعد یہ عسکری یلغار علمی وفکری اور تہذیبی یلغار میں تبدیل ہوگئی، اسلام دشمنی نے پورے یورپ کو متحد رکھا، یورپی سامراج کا عہد شروع ہوا، تو یورپین اتحاد میں پھر اختلافات پیدا ہوئے، اور ایشیا اور افریقہ کے کمزور وضعیف ملکوں پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے یورپی ملکوں کے درمیان زبردست کشمکش شروع ہوگئی، خاص طور پر فرانس، پرتگال، اور برطانیہ کے درمیان، اور کمزور ایشیائی وافریقی ملکوں کا اقتدار اعلیٰ ایک ملک سے دوسرے ملک میں منتقل ہوتا رہا، اور اس سیاسی کشمکش اور طمع سے ہندوستان اور جنوبی ایشیا کے ممالک بھی محفوظ نہ رہ سکے۔

نازیت کے غلبہ وتسلط کی وجہ سے دنیا پھر دو کیمپوں میں منقسم ہوگئی، جرمنی مخالف اتحادیوں اور حلیفوں نے آمرانہ نظام کے خلاف جنگی محاذ کھول دیا، اور ایسی بھیانک جنگ ہوئی جس میں لاکھوں انسانی جانیں ضائع ہوگئیں، نازیت تمام دوسری طاقتوں اشتراکیت، سرمایہ داری، مشرقی اور مغربی طاقتوں کا مشترکہ دشمن اور نشانہ بن گئی، اسی کے ساتھ ساتھ ترکی بھی یورپ کا مشترک دشمن بنا رہا، یورپ نے خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کے لئے اپنی تمام عسکری، فوجی، اقتصادی اور سازشی طاقت وقوت جھونک دی، خلافت عثمانیہ کے سقوط وزوال اور ترکی پر سیاسی غلبہ حاصل ہوجانے کے بعد یورپین رہنماؤں کو ایک دشمن سے نجات ملی تھی، ایشیا وافریقہ میں اشتراکی نظام کے بڑھتے ہوئے اثر ونفوذ، غلبہ اور اشتراکیت کا یورپ کے سیاسی مفادات کو چیلنج کرنے کی وجہ سے یورپین ملکوں کے درمیان اختلافات اور فاصلے قائم ہوگئے اور یورپ دو دھڑوں میں منقسم ہوگیا، مشرقی یورپ اور مغربی یورپ، اشتراکیت نے جو سرمایہ دارانہ نظام کی دشمن تھی، مشرقی یورپ کو ایک بلاک کی شکل دی اور اشتراکیت دشمن مغربی یورپ الگ بلاک بن گیا، جو سرمایہ دارانہ نظام اور سامراج کو پسند کرتا تھا، یہ جھگڑے شدید سے شدید تر ہوتے گئے جس نے طویل سرد جنگ کی شکل اختیار کرلی۔

مغربی یورپ نے امریکہ کے تعاون ومدد سے اپنی ساری طاقت وقوت اشتراکی

نظام سے جنگ میں لگادی، کمیونزم یورپ کا پہلا دشمن بن گیا، یہ دشمنی اور جارحیت اس حد تک بڑھ گئی کہ ہر وہ شخص جو اشتراکی میلان ورجحان رکھتا ہو، جمہوری ملک کا دشمن اور غدار سمجھا جاتا تھا، اور اسے K.J.B. کا ایجنٹ خیال کیا جاتا تھا، اسی طرح اشتراکی ممالک ہر اس شخص کو اپنے ملک کا دشمن سمجھتے تھے جس کے اندر مذہب اور آزاد معاشرہ کا میلان پایا جاتا ہو، یا غیر اشتراکی ملک سے تعلق رکھتا ہو، اور اسے C.I.A. کا ایجنٹ تصور کیا جاتا تھا، اس الزام میں بہت سے بے گناہوں کو تختۂ دار پر چڑھا دیا گیا یا سخت ترین سزاؤں سے گزرنا پڑا، اور اپنے جائز حقوق سے محروم ہونا پڑا، اشتراکی ملک میں سیاسی حقوق کے حصول یا آزادی کے حصول کی کسی بھی سرگرمی کو سازش قرار دے دیا جاتا تھا، اور اس کے پس پشت سرمایہ دار یورپین ممالک خصوصاً امریکا کا ہاتھ سمجھا جاتا، اور مغربی یورپ کے اتحادی ملکوں میں ہر مخالفانہ سیاسی سرگرمی کو کمیونسٹ سازش سمجھا جاتا اور اس کے پیچھے روس یا کمیونسٹ چین کا ہاتھ خیال کیا جاتا تھا، ہزاروں بے گناہ ان مخالفانہ ودشمنانہ تصورات کی بھینٹ چڑھ گئے، یہی صورت حال عربی واسلامی ملکوں کی تھی، احیاء اسلامی کے لیے سرگرم عمل تنظیموں کو امریکا اور اس کی سراغ رساں ایجنسیوں کا ایجنٹ سمجھا جاتا تھا، یہ کوئی بہت دور اور ماضی بعید کی بات نہیں ہے بلکہ اسی (۸۰) کی دہائی کے قبل کی بات ہے۔

افغانستان پر سوویت یونین کے حملہ کے وقت دنیا دو کیمپوں میں منقسم ہوگئی، ایک کیمپ سوویت یونین کا مؤید تھا، دوسرا افغان جہاد کا مؤید تھا، افغان جہاد کے امریکہ اور اس کے حلیف ملک مؤید تھے، چنانچہ یاسر عرفات نے جو اشتراکی میلان رکھتے تھے، سوویت یونین کے حملہ کی حمایت کی تھی، جب کہ مغربی یورپ سے نوبل ایوارڈ یافتہ سخاروف نے سوویت یونین کے حملہ کی مخالفت کی تھی اور اس کو جارحیت قرار دیا تھا، اسی وجہ سے سخاروت کو ایوارڈ لینے کے سلسلہ میں باہر سفر کرنے سے روک دیا گیا، امریکہ کے حلیف اسلامی ملک افغانی جہاد کی حمایت کر رہے تھے، جب کہ سوویت یونین کے اتحادی اسلامی ممالک سویت

یونین کے حملہ کی تائید وحمایت کررہے تھے۔

انڈونیشیا بھی کمیونزم اور سرمایہ دارانہ نظام کی کشمکش کا شکار ہوا، اور اس کشمکش کے سبب قتل عام کا شکار ہوا، کیوبا بھی اس کشمکش کا نشانہ بنا، کوریا دو حصوں میں منقسم ہوگیا، شمالی کوریا اور جنوبی کوریا، یمن بھی دو دھڑوں میں بٹ گیا، شمالی یمن اور جنوبی یمن، جرمنی بھی دو حصوں میں تقسیم ہوگیا، مشرقی جرمنی اور مغربی جرمنی، حتی کہ برلن کا شہر بھی منقسم ہوگیا اور دونوں کے درمیان دیوار قائم کردی گئی۔

ان ملکوں کی قوموں کو طویل تلخی اور کڑواہٹ کے گھونٹ پینے پڑے، اور یہ مختلف دھڑوں میں بٹ کر آپس میں لڑتے رہے۔

یہی صورت حال چین اور امریکہ کی تھی، چین امریکہ کو ہر روز دھمکیاں دیتا تھا اور امریکہ چین کے تختۂ حکومت کو پلٹنے کے لئے اپنا سارا زور لگاتا رہا، اور فارموسا(Formosa) کے چیانگ کائی شیک کی حکومت کی حمایت کرتا رہا، آخر کار ''کیسنجر'' کے خفیہ دورے کے بعد امریکہ نے چین کو تسلیم کیا، چین اقوام متحدہ کا ممبر بن گیا، سلامتی کونسل میں جگہ حاصل کرلی، اس لئے کہ چین ثابت قدم رہا اور امریکہ کو اس مسئلہ میں اپنی سیاست بدلنی پڑی، جس طرح ویت نام Vietnam کے مسئلہ میں اس کو جھکنا پڑا تھا، اور امریکہ نے اپنے حلیف فارموسا کو بے یار ومددگار چھوڑ دیا، اور اس چھوٹی حکومت کو سلامتی کونسل سے نکل جانے پر مجبور کردیا، اسی طرح کیوبا نے امریکہ کی جارحیت کا پامردی وثابت قدمی سے مقابلہ کیا، اور امریکہ کے مقابلہ میں جما رہا، امریکہ اس کو دہشت گرد قرار دیتا رہا، اس دوران اشتراکی نظام اور سرمایہ دارانہ نظام کی جنگ سخت ترین مرحلہ میں داخل ہوچکی تھی جب کہ سرد جنگ مختلف جگہوں پر گرم لڑائی کی شکل اختیار کررہی تھی، اور دنیا کے دوسرے مختلف ملکوں مثلاً ویتنام، کمبوڈیا، لاؤس، کوریا، انڈونیشیا اور ایشائی وافریقی ممالک جیسے صومالیہ اور کانگو کے جھگڑے جنگوں میں تبدیل ہوتے رہے، مغربی یورپین ملکوں خصوصاً امریکا نے اپنی ساری طاقت

وقوت اشتراکی ملکوں سے جنگ میں لگادی تھی، اور یہ ممالک اس اقتصادی، سیاسی اور فکری یلغار کے سامنے پامردی سے ڈٹے رہے، ان میں اکثر ملکوں نے اپنی بالادستی باقی رکھی اور مغربی سامراجی ملکوں کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کیا، حتی کہ کیوبا بھی مطیع نہ ہوسکا جب کہ وہ امریکی طاقت کے نرغے میں تھا۔

سوویت یونین کا سقوط اور اس کے اتحادی ممالک میں انتشار، یہ نتیجہ تھا اس کے افغانستان کے معاملات میں الجھنے کا اور اس کی فوجی مداخلت کا، جس سے اس کی اقتصادی اور عسکری طاقت کو زبردست دھچکا لگا، جس سے اس کا وقار اور دلوں سے اس کا رعب و دبدبہ ختم ہوگیا، اور وہ زبردست نقصانات سے دوچار ہوا جس سے اس کی اقتصادیات کو غیر معمولی نقصان پہنچا، اس کا عسکری نظام کمزور ہوگیا، اور تسلط وغلبہ حاصل کرنے کی صلاحیت ختم ہوگئی، سوویت یونین کے سقوط اور افغانستان میں اس کی بدنامی ورسوائی کی وجہ سے وہ نظام منقسم اور منتشر ہوگیا جس کو مغربی ممالک امریکہ کی قیادت میں چیلنج کرتے تھے۔

اشتراکیت دشمن ملکوں نے سوویت یونین کے سقوط وبکھراؤ کو اپنی کامیابی سے تعبیر کیا، حالانکہ یہ بہت بڑا مغالطہ تھا اور صورت حال کا غلط اندازہ تھا، مشترک اشتراکی دشمن سے نجات مل جانے کے تصور کی وجہ سے یہ ممالک ایک نئے دشمن کی طرف متوجہ ہوگئے، حالانکہ یہ نیا دشمن وہی پرانا دشمن تھا، جس سے یورپ کئی صدیوں تک جنگ کرچکا تھا، اور اس میں یورپ کو کوئی قابل ذکر کامیابی نہیں ملی تھی، صلیبی جنگوں کے طویل تجربہ کی بنیاد پر یورپی رہنماؤں نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ اسلام ایک ایسی قوت ہے جس کا عسکری قوت سے مقابلہ نہیں کیا جاسکتا، لارینس براؤن Lawrence Braun کہتا ہے۔

> ''پہلے ہم یہودی خطرے سے ڈرتے تھے، زرد خطرے (جاپان۔چین) سے ڈرتے تھے اور اشتراکیت سے ڈرتے تھے لیکن یہ خیال غلط ثابت ہوا، اس لئے کہ یہود ہمارے دوست نکلے، چنانچہ ان پر ظلم کرنے والا ہمارا جانی دشمن ہوگا، پھر دوسری جنگ کے دوران اشتراکی ہمارے حلیف بنے، رہا زرد خطرہ

(جاپان۔چین) تو اس سے نمٹنے کے لئے بڑی جمہوری حکومتیں کافی ہیں، لیکن ہم کو حقیقی خطرہ مسلمانوں سے ہے، کیونکہ مسلمانوں کے پاس دوسروں کو زیر کرنے اور اپنی خواہش کے تابع بنانے کی زبردست صلاحیت وقدرت موجود ہے، اور یہ زبردست حیرت انگیز حیات بخش طاقت وقوت کے مالک ہیں"۔

ایک دوسرا مغربی رہنما کہتا ہے:۔

"میرے خیال میں کمیونزم یورپ کے لئے کوئی خطرہ نہیں بلکہ حقیقی خطرہ اسلام سے ہے، جو ہم کو براہ راست چیلنج کر رہا ہے، مسلمان ہماری مغربی دنیا سے الگ اپنی ایک مستقل دنیا رکھتے ہیں، ان کے پاس خالص روحانی سرمایہ ہے اور وہ ایک حقیقی، سچی اور تاریخی تہذیب وتمدن کے مالک ہیں، مسلمانوں میں اس کی صلاحیت واہلیت ہے کہ وہ بغیر کسی تعاون ومدد کے ایک نئی دنیا کی بنیاد رکھ سکتے ہیں، مسلمانوں کے اپنے مقاصد کو بروئے کار لانے کے لئے صرف اس صنعتی اور ٹیکنیکل ترقی کی ضرورت ہے جو مغرب نے حاصل کر لی ہے"۔

یہ تاریخی پس منظر اور بیانات ایک طرف اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ یورپ اسلام کو اپنا سیاسی، دینی اور ثقافتی دشمن اور حریف سمجھتا ہے، تو دوسری طرف اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ یورپ کی فطرت خوف ودہشت ہے۔ یورپ ہمیشہ اپنے اتحاد اور زندگی کے لئے کسی نہ کسی ملک یا نظریہ سے متصادم رہا ہے جو اس کے تصور کے خلاف ہو، یا اس کے لئے خطرہ بن سکتا ہو اور اثر ڈالنے کی صلاحیت وقوت رکھتا ہو، یورپ ہمیشہ ایک دشمن رکھتا ہے جس سے وہ برسر پیکار رہتا ہے، غرور وتکبر، چودھراہٹ وہٹ دھرمی اور دوسروں کو مغلوب رکھنا یورپ کی وہ فطرت وذہنیت ہے جو سائنس اور تہذیب وثقافت کے فروغ اور عام ہو جانے کے باوجود بدلی نہیں ہے، یورپ کے کمزور ہو جانے کے بعد اس کی ذمہ داری اب امریکہ نے سنبھال لی ہے۔

مغرب کا دوہرا معیار

انسانی معاشرہ اور سماج ہر دور میں چند حقیقتوں اور معروف قدروں کا پابند رہا ہے، جن میں کسی قسم کا تغیر وتبدل نہیں ہوا۔ جیسے عفت و پاکدامنی، سخاوت وفیاضی، صدق وراستی، وفاشعاری اور ایثار، ہر دور میں مہذب انسان ان کا لحاظ رکھتا رہا ہے، اور ان کو اپنا کر فخر بھی کرتا رہا ہے، چنانچہ وہ اپنی ذات کے ساتھ ہر طرح کی بدسلوکی تو گوارا کرسکتا ہے لیکن وہ چیز جو غیرت، خودداری وفاداری، سچائی اور بلند ہمتی کے منافی ہو، اسے برداشت نہیں کرسکتا ہے۔ کیونکہ یہ اوصاف انسانی شعائر اور اس کی اہم خصوصیات وامتیازات میں سے ہیں۔

مختلف مذاہب نے ان ثابت شدہ حقائق کی تائید وآبیاری کی، کبر ونخوت، خود پسندی اور منفی عصبیت کی آلودگیوں سے اسے صاف کیا، تاکہ یہ ذاتی تصورات معاشرہ کی تعمیر کی راہ میں رکاوٹ نہ بنیں، تمام مذاہب ایثار، غیرت وخودداری کے ساتھ تواضع اور سخاوت وفیاضی کے داعی ہیں، حیا اور پاکدامنی، عفت وعصمت جملہ مذاہب کی مشترکہ قدروں اور اخلاقی قانون کا اہم عنصر ہیں، منقول اقوال میں ہے: ''جب حیاء نہ رہے تو جو جی چاہے وہ کرو'' جو صفت حیاء سے عاری ہوتا ہے وہ آوارہ، بداخلاق اور گستاخ سمجھا جاتا ہے، حتی کہ زمانہ جاہلیت میں بھی یہ تصور پایا جاتا تھا۔

جدید تہذیب کے علمبرداروں کی پوری کوشش ان قدروں کے پامال کرنے اور ان کے منافی امور اپنانے پر لگی ہوئی ہے، اس لیے کہ ان کا نظریۂ ارتقا ثابت شدہ امور وحقائق کو ماننے کے خلاف ہے۔ ہر چیز ان کی نگاہ میں تبدیلی کی محتاج ہے، حسن وقبح ان کی

نظر میں کوئی ثابت شدہ چیز نہیں؛ بلکہ ان کے نزدیک ہر دور کا اور ہر معاشرہ کا انسان اپنے تصور وخیال کے مطابق حسن وقبح، مفید وغیر مفید، اور نافع وغیر نافع کا تعین کرنے کا حق رکھتا ہے، ایسا ہوسکتا ہے کہ کوئی چیز کسی زمانہ اور معاشرہ میں سود مند اور نفع بخش ہو، مگر دوسرے زمانہ ومعاشرہ میں وہ مضر قرار پائے۔

جمہوریت (DEMOCRACY) کی دعوت دینے والوں کا خیال ہے کہ انسان کی رائے اور خواہشات ہی قانون کی اساس وبنیاد ہیں اسی کے مطابق قانون وضع کئے جانے چاہئیں، سوشلزم واشتراکیت (SOCIALISM) کے حاملین تمام ثابت شدہ اقدار کے منکر ہیں، اور تجدد پسند طبقہ ہر پرانی چیز چھوڑ دینے حتی کہ معاشرتی رسم ورواج، اخلاقی ذمہ داریوں سے بھی دست کش ہوجانے کی دعوت دیتا ہے۔ اور ہر وہ چیز جو معاشرہ میں رائج ہو اور جسے قبول عام حاصل ہو چکا ہو اسے چھوڑ دینا ان کی فکر سے میل کھاتا ہے۔ ان کا کہنا ہے: انسان ہی ہر قانون وضابطہ کا سرچشمہ اور اساس ہے اور اسے حق ہے کہ جو قانون چاہے وضع کرے، یہ لوگ ایک عام دائرہ کا تعین کرتے ہیں، پھر اس کے عمومی تصور کی روشنی میں قوانین وضوابط طے کرتے ہیں۔ اس لئے کوئی ایسا قانون وقاعدہ بنانا ممکن نہیں جو شہر یا وطن یا ملک کے مفاد (جس کا تعین وہ کرتے ہیں) کی خلاف ورزی کی اجازت دے اور جس سے ملک کی سیاست کے خلاف عمل کرنے کی گنجائش نکلے یا جس میں ان قوانین کی مخالفت لازم آئے جن کی صراحت ان کے طے شدہ آئین ودستور میں ہے جو بھی ان قوانین واصول کی خلاف ورزی کرتا ہے اُسے عدلیہ کے روبرو پیش کرکے سزا دلوائی جاتی ہے، البتہ ممبران پارلیمنٹ کو قانون میں اصلاح وترمیم کا حق حاصل رہتا ہے، اور اس طرح کی تبدیلیاں اور اصلاحات جمہوری ملک کے قوانین میں ہوتی رہتی ہیں۔

موجودہ زمانہ میں قوانین میں ردوبدل کا دائرہ بہت وسیع ہو چکا ہے، یہاں تک کہ انسانی تصور کے ثابت شدہ حقائق پر بھی اس کا اثر پڑنے لگا ہے، چنانچہ کئی یورپین ممالک

کے قوانین میں شراب نوشی، قمار بازی، اور موروثی ازدواجی تعلقات کی بابت ترمیمات ہوئی ہیں جس کے نتیجہ میں گذشتہ ادوار میں جو ناجائز اور مبغوض تھا اسے سند جواز اور مقبولیت مل گئی، قانون سازوں کی فکر کا محور یہ ہے کہ جس عمل کو بھی قبول عام حاصل ہو جائے اس کی تکمیل میں اگر قانونی پیچیدگیاں اور رکاوٹیں حائل ہوں تو کوئی نیا قانون وضع کر کے اسے دور کر دینا چاہئے تا کہ کسی کو اپنے نفس اور انسانی مصالح کی خلاف ورزی نہ کرنی پڑے۔

اس نقطۂ نظر کی روشنی میں خیر شر اور شر خیر بنتا جا رہا ہے، بدی نیکی اور نیکی بدی کا روپ دھار رہی ہے، چونکہ یورپ میں ادیان و مذاہب، تہذیب و تمدن کے ہم رکاب اور پیرو ہیں۔ اس لئے متدین طبقہ بھی اس نظریہ و خیال کا ہم نوا بنتا جا رہا ہے کہ جو بھی چیز قبول عام حاصل کر لے اور جس کا چلن عام ہو جائے، اگر چہ وہ دینی فکر کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، اسے دینی اعتبار سے جائز قرار دیا جائے۔ جیسا کہ قانونی اعتبار سے اُسے جواز ملا ہوا ہے۔

تہذیب نو کی فکری اساس میں بہت سے تناقضات و تعارضات ہیں جن کا ظہور اس وقت ہوتا ہے جب ان کا نفاذ عمل میں آتا ہے۔ ایک طرف مغرب اپنے ملکوں میں فکر و رائے، عمل و پیشہ اور آمدنی و کمائی کی آزادی کی دعوت دیتا ہے، دوسری طرف ایسی سیاست کھیلتا ہے جو دوسرے ملکوں میں آزادی کو اس کی تمام قسموں سمیت سلب کر لیتی ہے، مغرب کی آزادی کا تصور صرف اخلاق کے دائرہ میں محدود ہے، سیاست اور مذہب پر اس کا انطباق نہیں ہوتا۔ اسی طرح ثقافت کے بارے میں مغرب اپنی ثقافت رائج کرنے پر مصر ہے۔ مگر دوسروں کی ثقافت کا سخت مخالف ہے دین و مذہب کے بارے میں بھی اس کا یہی رویہ اور طرز عمل ہے، اور متناقض پالیسی سے مغرب پوری دنیا میں نصرانیت کی ترویج کی کوشش کرتا ہے، اور جب مغربی ممالک کے اقتصادی ادارے عیسائی بنانے کی مہم میں مالی تعاون فراہم کرنے، عیسائی مشن کا جال بچھانے اور مشنری اسکول، مسیحی امتیازات کی حامل ویلفیئر سوسائٹیوں (WELFARE SOCIETIES) کے قیام میں حصہ لیتے ہیں۔ اس کے

اہل قلم دوسرے مذاہب پر تنقیدی کتابوں کی اشاعت، ان کے عقائد اور دوسری تہذیب کو مسخ کر کے پیش کرتے ہیں تو مغرب اسے دقیانوسی اور رجعت پسندانہ عمل کا نام نہیں دیتا۔ بلکہ وہ اسے آزاد خیالی اور اظہار رائے کی آزادی قرار دیتا ہے۔ لیکن اگر کوئی اس کا جواب دیتا ہے تو یہ جواب آزادیٔ اظہار رائے کے خلاف ہو جاتا ہے۔ اسلامی عمل، اسلامی تنظیموں اور مسلمانوں کی اسلامی تعلیمات اور اخلاقی قدروں کی اتباع کرنے کی دعوت کو رجعت پسندی اور دقیانوسیت کہا جاتا ہے بلکہ اس سے بھی دو قدم آگے بڑھ کر اسے دہشت گردی سے موسوم کیا جاتا ہے۔

آزاد خیالی (LIBERALIASM) جس کی دعوت اباحیت، ذاتی اور پرائیویٹ معاملات میں دخل اندازی نہ کرنا، کسی اصول کے ماننے پر کسی کو مجبور نہ کرنا، کسی عمل کو بہتر سمجھ کر کسی پر لازم نہ کرنا، اور نہ ہی کسی کو برا سمجھ کر اس سے روکنا ہے۔ بیرونی دنیا میں مانے جانے والے دیگر عقائد اور دعوتوں کے تئیں مغرب کے رویہ اور موقف کو قطعاً سند جواز فراہم نہیں کرتی۔

اس آزاد خیالی کا تقاضا یہ ہے کہ خیر کی طرف بلانا، نیک اعمال پر عمل کرنا اور اس کی طرف بلانا، برے اعمال سے بچنا اور اس سے باز رکھنا، چھوڑ دیا جائے۔ اور کوئی ایسا کام نہ کیا جائے جس سے دوسروں کے داخلی و ذاتی امور میں دخل اندازی ہوتی ہو، کیوں کہ مغرب فرد کی مطلق آزادی کا داعی ہے، کسی کی سرگرمیوں اور اس کے طرز زندگی پر کسی بھی قسم کی پابندی نہ لگانے کا علمبردار ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ہر فرد آزاد ہے جو کرنا چاہے کرے، جو طرز زندگی اپنے لئے بہتر سمجھے اپنائے، جسے اس کا ذہن قبول نہ کرے چھوڑ دے، کسی کو اس کا حق نہیں کہ جس چیز کو وہ اچھا اور بہتر سمجھے اُسے اُس پر تھوپنے کی کوشش کرے، جو اسے بہتر نہیں خیال کرتا، لیکن یہی آزادی کا داعی مغرب دوسرے ملکوں پر اپنے تصورات تھوپنے پر مصر ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ مغرب ثابت شدہ امور میں سے اسلام دشمنی اور اچھی قدروں کی

پامالی کے سوا کسی چیز کو نہیں مانتا، اور شخصی زندگی، قومی زندگی میں کسی بھی قسم کی پابندی عائد کرنا نہیں چاہتا۔ وہ طرز عمل، اخلاقی مکاتب فکر میں مکمل آزادی کا خواہاں ہے، حالانکہ ظلم وزیادتی، بدزبانی وبدکلامی، رحمت وشفقت، نرمی ومہربانی، محبت ومودت، ادب واخلاق اور عظمت وبلندی کے معانی ومطالب طے شدہ اور مقرر ہیں، چنانچہ ظلم وزیادتی کرنے والے کے متعلق یہ نہیں کہا جائے گا کہ یہ بہت نرمی پسند اور احسان کرنے والا ہے، اور نہ ہی بداخلاق وبےادب کے بارے میں کہا جائے گا کہ یہ بہت بااخلاق اور باادب ہے، اسی طرح زندگی اور اسے برتنے اور لوگوں کے ساتھ رہنے سہنے کے انسانی موقف ونظریات کے سلسلہ میں کچھ ثابت شدہ تصورات وخیالات ہیں۔ مادیت کا پرستار مغرب، جو ان تمام حدود وقیود سے آزادی کا نعرہ لگاتا ہے ان ثابت شدہ امور کو تسلیم نہیں کرتا۔ اس تضاد کی بنا پر مغرب اور مشرق کے درمیان مصالحت کس بنیاد پر ہوسکتی ہے؟ کسی بھی ایسے انسان کے ساتھ گذارا کیسے ہوسکتا ہے جس کے نزدیک ثابت شدہ قدریں اور ناقابل تسلیم نمونے نہ ہوں۔ جب ایک فریق چند تصورات کا پابند ہو اور دوسرا ان کا مخالف ہے، تو ان میں اتفاق کی سبیل کیا ہوسکتی ہے اور جب ایک فریق چند ثابت شدہ تصورات کا منکر ہو اور دوسرا ان کا قائل وتتبع، تو پھر دونوں میں ہم آہنگی اور سمجھوتہ کیونکر ہوسکتا ہے۔

یورپ کے مفکرین، حکام، سیاسی قائدین کے ساتھ معاملہ کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ اور دشواری یہی ہے، اور اس کو دور کئے بغیر سمجھوتہ اور اتفاق رائے ایک خواب وخیال ہی ہے۔ اتفاق کی شکل صرف غلامی ہے اور یہی غلامی یورپ کو مطلوب ہے اور نئے نظام کا مطلب ومقصد یہی ہے کہ ساری دنیا اقدار چھوڑ کر مغربی تصورات کی پابند ہوجائے۔

اسلام سے جنگ کا محرک مرعوبیت

یورپ اور اس کے حلیف ممالک جن کا دنیائے علم وادب اور آسمان فکر وفن میں طوطی بول رہا ہے اور جنہیں تہذیب وتمدن اور سیاست ومعیشت کے میدان کا امام ومقتدا خیال کیا جاتا ہے، اسکے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ وہ اسلام سے خائف اور مسلمانوں سے خوفزدہ ہے، تو اکثر لوگوں کو تعجب ہوگا اور تعجب کیوں نہ ہو؟ یورپ تو تہذیب وتمدن اور علم وصنعت میں ترقی کی ایک مثال ہے، دنیا میں اسی کا بول بالا ہے، مسلمان اور مسلم ممالک اس کے ماتحت اور کنٹرول میں ہیں، زندگی کے ہر شعبہ میں اسی کو برتری حاصل ہے۔

اس وقت نازی ازم اور کمیونزم جیسے خطرات پر قابو پا چکا ہے، تو پھر وہ کیوں اسلام سے اتنا خائف اور مسلمانوں سے اتنا اخوفزدہ ہے؟۔ تو جواب اس کا یہی ہے کہ یورپ پورا علم رکھتا ہے اسلامی تاریخ کا، مسلمانوں کی فتوحات کا، ان کے غلبہ اور بالادستی کا۔ یورپ کی اسلام ومسلم دشمنی جہالت وناواقفیت پر نہیں، بلکہ علم وبصیرت پر مبنی ہے۔

موجودہ اسلام مخالف جنگ کے پیچھے خوف وڈر کی نفسیات ہے جو کام کر رہی ہے، عیسائی مفکرین کھل کر یہ کہتے ہیں کہ ''اسلام یورپ میں بڑی تیزی کے ساتھ ترقی کر رہا ہے، اس بات کا خطرہ ہے کہ عیسائی اکثریت والے علاقے مسلم اکثریت والے علاقوں میں تبدیل ہو جائیں، اس کی وجہ صرف مسلمانوں کی شرح افزائش میں اضافہ ہی نہیں، بلکہ لوگوں میں اسلام اور اسلامی تعلیمات کی مقبولیت اور اس کی تحقیق وجستجو کا شوق بھی ہے، یورپ کے عوام نصرانیت کے مستقبل سے مایوس اور اپنے مذہبی پیشواؤں کی اخلاقی پستی کی

وجہ سے بے اعتمادی کا شکار ہیں، اسی لیے وہ کلیسا کا رخ نہیں کرتے، نتیجتاً کلیسا بند ہو رہے ہیں اور فروخت کئے جا رہے ہیں"۔

نصرانیت کی تاریخ کا جس نے بھی مطالعہ کیا ہوگا اسے معلوم ہوگا کہ نصرانیت کے دعویداروں کا دامن کتنے معصوم و بے گناہوں کے خون سے رنگین ہے، انسانی جان و مال اور عزت و آبرو کو کس بے دردی سے پامال کیا گیا ہے، اس دین کے متبعین کی تاریخ اور خود ان متبعین کو کس بری طرح کچلا گیا ہے، سامراجی عہد کے مظالم اور عالمی جنگوں سے کون واقف نہیں؟ اقتصادی اور سیاسی مفاد کے لئے کتنا جبر و قہر کا سلسلہ جاری ہے۔

یورپ مسلمانوں کو جاہل و ناخواندہ امت ہونے کا طعنہ دیتا ہے اور اس کی ذمہ داری اسلام پر ڈالتا ہے، حالانکہ یہ وہی یورپ ہے جس نے مسیحیت کی ماتحتی میں ہزار سالہ مدت ایک ان پڑھ قوم کی حیثیت سے بسر کی ہے، جس میں یورپ کے بڑے بڑے لیڈر اَن پڑھ اور جاہل تھے، امریکی مصنف ڈریپر کو اس کا اعتراف ہے، کہتا ہے:۔

"یورپ میں جہالت کا دور دورہ تھا، اوہام و خرافات کی حکمرانی تھی، علاج و معالجہ سب مقدس مقامات کی زیارت پر منحصر رہ گیا تھا، فن طب مردہ ہو چکا تھا، جوگیوں اور شعبدہ بازوں کی دکانیں چمک اٹھی تھیں۔

پرانی دنیا گیارہویں صدی عیسوی میں دو حصوں میں منقسم تھی، مغرب اور مشرق، مغرب چھوٹے چھوٹے بے حیثیت شہروں پر مشتمل تھا جہاں کسانوں کی جھوپڑیاں اور بے ڈھنگ گھر تھے، قلعوں کی تعمیر میں کسی فنی اصول کی رعایت ملحوظ نہ رکھی گئی تھی، وہاں قتل و غارت گری کا بازار گرم تھا، رہزنی و قزاقی کے خوف سے دس قدم بھی چلنا دوبھر تھا، دوسری طرف مشرق میں قسطنطنیہ، قاہرہ، دمشق و بغداد جیسے عظیم الشان آباد و پر رونق شہر تھے، جو اپنے حسن و دلکشی اور جاذبیت و دلربائی میں الف لیلائی دنیا کے شہر معلوم ہوتے، یہاں قیمتی پتھروں اور سنگ مرمر کے مکانات تھے، مساجد و مرائحز، مدارس و خانقاہوں کی کثرت

تھی، بڑے بڑے پُر رونق بازار تھے، جگہ جگہ وسیع اور سایہ دار باغات کا انتظام تھا، نظام آب پاشی تھا، جس کی وجہ سے کھیتیاں اور باغات سرسبز وشاداب تھے، تجارت شباب پر تھی، تاجر نہایت اطمینان کے ساتھ اسپین سے ایران تک کا سفر کرتے تھے"۔

دوزی کہتا ہے:۔

"یورپ میں لوگ جہالت کی تاریکی میں سرگرداں تھے، انہیں کہیں روشنی نظر نہیں آرہی تھی، روشنی تو صرف مسلمانوں کی طرف سے آرہی تھی، علوم وفنون، ادبیات، فلسفہ، حرفت وصنعت اور زندگی کے دیگر میدانوں میں امت مسلمہ رہبری کررہی تھی، بغداد، سمرقند، بصرہ، دمشق، قیروان، مصر، فارس، غرناطہ اور قرطبہ علم ومعرفت کے عظیم مراکز تھے، جبکہ یورپ کے مرکزی شہر دیہاتوں کی طرح تھے جہاں نہ تو علم تھا اور نہ آبادی"۔

ایک انگریز مؤرخ کہتا ہے:۔

"اسلامی اندلس میں اس وقت گھر گھر علم کا چرچا تھا جب کہ مسیحی دنیا میں بجز چند افراد کے کوئی لکھنا پڑھنا نہ جانتا تھا"۔

بعض انصاف پسند مغربی فضلاء نے انسانیت پر اسلام کے اثرات واحسانات کا اعتراف کیا ہے اور حقیقت ہے کہ انسانی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں اسلام کی اصلاحی وتعمیری چھاپ نہ موجود ہو۔ انسانی تہذیب کے ہر مرحلہ اور میدان میں اسلام کے بے پایاں اور دوررس اثرات کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ رابرٹ بریفالٹ (Robert Briffault) اپنی کتاب (The Making of Humanity) میں لکھتا ہے:۔

"یورپ کی ترقی کا کوئی ایسا پہلو نہیں، جس پر اسلامی تمدن کا احسان اور اس کے نمایاں آثار کی گہری چھاپ نہ ہو"۔

آگے چل کر لکھتا ہے:۔ "صرف طبعی علوم ہی (جن میں عربوں کا احسان مسلّم ہے) یورپ میں زندگی پیدا کرنے کے ذمہ دار نہیں ہیں، بلکہ اسلامی تمدن نے یورپ کی

زندگی پر بہت عظیم الشان اور مختلف النوع اثرات ڈالے ہیں اور اس کی ابتداء اسی وقت سے ہو جاتی ہے، جب اسلامی تہذیب وتمدن کی پہلی کرنیں یورپ پر پڑنی شروع ہوتی ہیں''۔

ہملٹن گب Hamilton A.R. Gibb لکھتا ہے:۔

''اسلام ایک تصور ہے، جو ایک مربوط لیکن مختلف سیاسی معاشرتی اور مذہبی اجتماعیت کی شکل میں ظاہر ہوا ہے، اور اس نے مختلف خطوں اور ادوار میں، مقامی، جغرافیائی، سماجی، سیاسی اور سماجی قوتوں سے اثر پذیر ہو کر مختلف خصوصیات کا اظہار کیا ہے''۔

مشہور برطانوی مورخ وفلسفی A.J. Toynbee اپنی کتاب ''تہذیب وثقافت کا امتحان'' میں لکھتا ہے:۔

''مسلمانوں کے درمیان نسلی امتیاز کا خاتمہ اسلام کے عظیم کارناموں میں سے ایک ہے اور موجودہ دور میں تو اسلام کی یہ سعادت وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے''۔

ولفرڈ کانٹویل اسمتھ لکھتا ہے:

''مسلمانوں کی کامیابی، ان کے مذہب کی داخلی کامیابی ہے، وہ صرف میدان جنگ میں فاتح نہیں ہوئے اور انہوں نے زندگی کے مختلف شعبوں پر ہی اثر نہیں ڈالا، بلکہ مقابلتاً مختصر عرصے میں انہوں نے زندگی کو ایک ایسی مجموعی شکل دینے میں کامیابی حاصل کی جسے تمدن کہتے ہیں''۔

مشہور مستشرق پروفیسر گب (Gibb) عالمی تہذیب کے لیے اسلام کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے لکھتا ہے:۔

''اسلام کو ابھی انسانیت کی ایک اور خدمت انجام دینی ہے۔۔۔۔لوگوں کے مراتب، مواقع عمل اور عمل کے لحاظ سے مختلف نسلوں کے درمیان مساوات قائم کرنے میں کسی سوسائٹی نے اس کی جیسی کامیابی نہیں حاصل کی ہے، افریقہ، ہندوستان اور انڈونیشیا کے عظیم اور جاپان کے محدود مسلم معاشرے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ کس طرح اسلام

مختلف نسلوں اور روایات، نہ مٹنے والے اختلافات کو تحلیل کر دیتا ہے اگر مشرق و مغرب کی عظیم سوسائٹیوں میں مخالفت کے بجائے باہمی تعاون پیدا کرنا ہے تو اس کے لیے اسلام کی خدمات حاصل کرنا لازمی ہوگا''۔

یورپین مؤرخین نے ہم پر یہ الزام لگایا کہ ''مسلمانوں نے کتب خانہ اسکندریہ کو نذر آتش کیا ہے'' اس جھوٹے دعوے کا کھوکھلا پن اور ان کی کذب بیانی طشت از بام ہو چکی ہے، مگر ان علمبرداران تہذیب وثقافت کو یہ تو سوچنا چاہئے کہ خود انہوں نے اس سے بڑے بڑے کتب خانوں کو نذر آتش کیا ہے جیسا کہ امریکا نے عراق میں کیا ہے، صرف کتب خانے ہی برباد نہیں کئے، بلکہ اہل علم کا قتل عام کیا۔

مسلمانوں پر لگایا جانے والا ہر الزام، انہی الزام لگانے والے علم وتہذیب کے دعویداروں کی تاریخ سے ماخوذ ہے، اسی ''بنیاد پرستی'' کو لیجئے جسے وہ اسلام کا لازمہ قرار دینے پر مصر ہیں، وہ اسلام کا نہیں مسیحیت کا جزء ہے، آج بھی یورپ کے بعض عیسائی فرقے کٹرپن اور پرتشدد عقیدہ رکھتے ہیں، اور علم ومعرفت، تحقیق اور رواداری کے منکر ہیں۔

درحقیقت یورپ کو خوف اسلام سے نہیں، اس کی مؤثر ورواداراانہ تعلیمات، تسخیری صلاحیت اور دلوں کو فتح کر لینے والی قوت سے ہے۔ تاریخ کے مطالعہ سے وہ مسلمانوں کے قرآن وسنت سے مضبوط تعلق، خدا اور رسول کی بے پناہ محبت، اسلامی تعلیمات پر ان کے اعتماد ویقین، اور راہِ خدا میں جاں سپاری وجاں نثاری کے بے مثال جذبہ کا اندازہ لگا چکا ہے، اسے معلوم ہو گیا ہے کہ مسلمان اسلام کے تحفظ کی خاطر جان ومال، عزت ومتاع ہر قسم کی قربانی پیش کر سکتے ہیں، لیکن اس کے دامن پر کوئی بدنما دھبا برداشت نہیں کر سکتے، اسلام کے عوض انہیں کوئی سودا منظور نہیں ہوگا۔

یورپ وامریکا میں اسلام کی مقبولیت اور وہاں کی عوام میں مطالعۂ اسلام کے بڑھتے ہوئے شوق ورجحان سے اس خوف وہراس میں اور اضافہ ہو رہا ہے، حالیہ اقتصادی

بحران میں جس نے یورپ کے اوسان خطا کر دیئے تھے اس خوف ودہشت اور اسلام پسندی کے رجحان کا مشاہدہ بھی ہوا ہے، جب اسلام کا مطالعہ کرنے والے بعض روشن خیال مفکرین نے برطانوی پوپ کی طرح اسلامی شریعت کے نفاذ وتطبیق کا مطالبہ کیا، یورپ کے فرمانرواؤں اور مفکرین کو بھی اس کا احساس ہے۔

اسلام کی طاقت وقوت، اور اس کی قائدانہ صلاحیت ہی دراصل یورپ کو اسلام کے خلاف میدان جنگ میں کھینچ کر لائی ہے، اسے یورپ کی اسلام سے مرعوبیت کے سوا اور کہا ہی کیا جاسکتا ہے، خوف وڈر فطرتاً جسمانی واعصابی کمزوری کا نتیجہ ہوا کرتا ہے، یہ اس کمزور وناتواں انسان کی صفت ہے جسے اپنی طاقت وقوت پر اعتماد نہیں، یورپ اور اس کے حلیف ممالک کا اسلام سے یہ خوف ومرعوبیت، اسلام کی طاقت وقوت اس کی فاتحانہ وقائدانہ صلاحیت کے اعتراف کی غمازی کرتا ہے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ اسلام ایک دین فطرت ہے، جس میں دلوں کو فتح کرنے کی محیر العقول صلاحیت پنہاں ہے، وہ نوع بشری کی دینی ودنیوی ضروریات کی تسکین کا نسخۂ کیمیا ہے، وہ دین ودنیا کے مابین تفریق کا قائل نہیں بلکہ دونوں کی جامعیت کا داعی ہے، وہ نہ تو عیسائیت کی طرح ترک دنیا کا پیغامبر ہے اور نہ اس کے برعکس دنیا پرستی کا مذہب، وہ عقلیت ومادیت کے تنگ نظریوں سے ماوراء دین کی آفاقیت وبیکراں وسعت کا قائل ہے، اس کے عناصر ترکیبی عدل وانصاف، اخوت ورواداری، الفت ومحبت، غمخواری وہمدردی اور پُرامن بقائے باہم کے لیے زریں اصول ہیں، وہ دیگر مذاہب کے بالمقابل انسان کو قابل عزت ولائق احترام مخلوق سمجھتا ہے، اسلام کی ان خوبیوں اور اچھائیوں سے ہر وہ شخص واقف ہوگا جس نے عصبیت ونسل پرستی، عداوت ودشمنی سے بلند ہوکر اس کی تعلیمات کا بنظر غائر مطالعہ کیا ہو۔

یورپ ایک طویل مدت تک اسلام کے تعلق سے غلط فہمی میں مبتلا رہا ہے یہی وجہ ہے کہ آج باوجود یہ کہ اس نے علوم وفنون، بحث وتحقیق کے میدان میں زبردست ترقی کی

ہے اور اختراع و ایجاد کے نئے نئے قلعے مسخر کر لئے ہیں، وہ صنعت و ٹیکنالوجی کا امام اور فن ہندسہ و آرٹ کا موجد خیال کیا جانے لگا ہے، لیکن اس سب کے باوجود اس کی بحث و تحقیق کا انحصار متقدمین کا موروثی سرمایہ اور بوسیدہ و پارینہ ذخیرہ ہے اور یورپ اسی قدیم لٹریچر پر آنکھ بند کر کے یقین کئے ہوئے ہے، حالانکہ قدیم کتابوں کا یہ تمام ذخیرہ دراصل صلیبی جنگوں کے بعد یورپ کو اسلام سے بچانے اور دور رکھنے کے لیے وجود میں آیا تھا اور آج یورپ کی یہ معاندانہ ذہنیت اسی قدیم لٹریچر کی پیداوار ہے، اس ذہنیت پر غلبہ پانے اور اسے تبدیل کرنے کے لیے قومی و نسلی عصبیت سے اوپر اٹھ کر اسلام کے آزاد و غیر جانبدارانہ مطالعہ کی ضرورت ہے، عیسائیت و اسلام کے مابین خلیج کو مزید وسعت دینے کے بجائے، پر امن بقائے باہم اور افہام و تفہیم اور باہمی صلح و آشتی کے اصول طے کیے جانے چاہئیں، یہ اس لیے کہ یہ دونوں مذہب دنیا کے سب سے بڑے مذہب ہیں، اور ان دونوں میں باہمی تعاون و ہمدردی، اخوت و رواداری کی تعلیم زیادہ ہے۔

عیسائی مفکرین اور مذہبی پیشواؤں کے دعوے کے مطابق مسیحیت امن و آشتی، محبت و جاں نثاری اور ایثار و قربانی کا مذہب ہے، لیکن اسلام سے بیجا خوف و دہشت نے آج اسے بغض و عناد کا مذہب بنا دیا ہے، اس کے رہنما عیسائیت کی حقیقی تعلیمات کو پیش کرنے کے بجائے اسلام پر حملہ کو اپنے مذہب کی حفاظت کا ذریعہ سمجھتے ہیں، اس مخالفانہ و معاندانہ ذہنیت کی تبدیلی جسے بعض مفکرین یورپ اور سیاسی قائدین مزید تقویت پہونچا رہے ہیں، امن عالم کے لئے بہت ضروری ہے، اس لیے کہ یہ دونوں مذہب دنیا کے سب سے بڑے اور اثر و اقتدار کے حامل مذہب ہیں اور یہ ذہنیت دین کی حقیقی روح کے مخالف بھی ہے، بغیر اس تبدیلی کے دنیا میں امن و سلامتی کا قیام اور انسانی معاشرہ میں اتحاد و اتفاق اور افہام و تفہیم کی فضا نہیں قائم ہو سکتی۔

اس معاندانہ ذہنیت کو تبدیل کرنے کے لئے عالمی سطح پر کوششیں ہونی چاہئیں،

عالم اسلام کی طرف سے اس میں پہل کی گئی ہے، مگر مسیحی دنیا کی طرف سے اور خاص طور پر کلیسا کے ذمہ داروں کی طرف سے ابھی تک کوئی مثبت اقدام نہیں کیا گیا، ایک انسان جہالت وناواقفیت کی وجہ سے اگر کسی چیز کا دشمن اور اس کی صلاحیت کا منکر ہو تو اسے سمجھایا جاسکتا ہے، لیکن جان بوجھ کر محض عناد و دشمنی، بغض وعداوت کے جذبات سے مغلوب ہو کر جو کسی چیز کا منکر ہو، اسے نہ تو سمجھایا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس کی ذہنیت تبدیل کی جاسکتی ہے۔

موجودہ عہد کے فساد کی بنیاد

موجودہ دور میں ذرائع ابلاغ اورنشر واشاعت کی سہولتوں اور مادی وسائل، طباعت اور سوشل میڈیا کی ترقی نے ہر صاحب قلم اور اپنے مافی ضمیر کی ادائیگی پر قدرت رکھنے والے کو قلم اٹھانے کا اچھا موقع فراہم کردیا ہے، پرشور زندگی میں معیار زندگی کو بلند کرنے کے لیے کی جانے والی مسلسل جدوجہد نے ہر شخص کو متنوع لٹریچر پڑھنے کا موقع فراہم کردیا ہے، جس سے وہ اپنی معلومات میں اضافہ کے ساتھ اپنے مسائل سے کچھ دیر کے لیے سکون حاصل کرسکے، اس کی وجہ سے رسائل، اخبارات، قصہ کہانی کی کتابوں اور ناولوں کی طلب میں بڑا اضافہ ہوگیا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس دور میں ہر قسم کے رطب ویابس، سنجیدہ وتفریحی، دین ودنیا، علم وجذبات، شعور واحساس سے متعلق مواد بازار میں فراہم ہوتا ہے، ہر شخص اپنے ذوق اور معیار علم کے مطابق اس کا انتخاب کرسکتا ہے، ٹرین میں، بس میں، ہوائی سفر میں بھی وقت گذاری کے لیے کسی کتاب یا رسالہ، اور ملٹی میڈیا موبائل یا ٹبلیٹ کا ساتھ رکھنا ثقافت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔

کتب بینی سے اس غیر معمولی دلچسپی اور مضمون نگاری کے لیے مواقع کے حصول کے نتیجے میں بہت سے ذاتی کتب خانے اور ایسی اکیڈمیاں قائم ہوگئی ہیں جہاں دین ودنیا دونوں سے متعلق کتابیں دستیاب ہیں، جو افکار ونظریات کو سنوارتی بھی ہیں اور بگاڑتی بھی، جن سے اخلاقی قدروں کی تعمیر بھی ہوتی ہے اور تخریب بھی اور جو انسانوں کو انتہا پسندی، دہشت گردی اور دوسروں کے ساتھ بدمعاملگی پر بھی آمادہ کرتی ہیں، یہ کتابیں سڑکوں، ریلوے اسٹیشنوں اور بس اسٹینڈوں پر قائم بک اسٹالوں سے فراہم ہوسکتی ہیں، اور چلتے

پھرتے آواز لگالگا کر کتابیں، افسانے، رسائل، ماہنامے، میگزین، جاسوسی ناول، سفرنامے اور علمی وتاریخی تحقیقات بیچنے والے بکثرت نظر آتے ہیں، پڑھنے کی عادت ایسی عام ہوگئی ہے کہ بعض لوگ سونے سے پہلے کوئی تفریح آمیز یا سنسنی خیز کتاب پڑھے بغیر سو نہیں سکتے۔

مطالعہ کے اس غیر معمولی شغف کے نتیجے میں نشر واشاعت کے اداروں کو جو عظیم الشان فوائد حاصل کر رہے ہیں، حوصلہ منداور مادی نفع حاصل کرنے والے انشاء پردازوں کی ضرورت پڑتی ہی، اور بسا اوقات مشہور اور نامور مصنفوں کو بھی ایسے موضوعات پر لکھنے کے لیے مجبور کیا جاتا ہے جو دلوں کو موہ لیں اور بازار میں اسے مقبولیت حاصل ہو، اور ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا جائے، ایڈیشن کے ایڈیشن نکلتے جائیں، لہذا بہت سے مفکرین اور اہل قلم ان کے دام میں پھنس کر ان پرکشش موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں جو پڑھنے والوں اور خریداروں کو اپنی طرف کھینچ لیں۔

اس طرح آج کے دور میں کتابیں لکھنا اور اخبار نکالنا مادی فوائد کے حصول کا ایک بڑا ذریعہ بن گیا ہے، اب وہ تعلیم وتربیت یا اخبار واطلاع کا ذریعہ نہیں رہا، اس لیے مصنفوں کی حقیقی نیت معلوم کرنے کے لیے جب ان کی کتابوں کا جائزہ لیا جاتا ہے کہ وہ علمی وفکری ہیں یا مادی وتجارتی، تو بیشتر مصنفوں کا نام پیشہ وروں کی فہرست میں آتا ہے، اور یہ بات اخبارات ورسائل کے تبصروں اور کتابوں میں پیش کردہ افکار ونظریات کے درمیان تقابل سے نمایاں طور پر سامنے آجاتی ہے، کتابیں موقع وحالات کے مطابق لکھی جاتی ہیں، جس طرح سیاسی لیڈر اپنے مفاد اور موقع کے اعتبار سے اپنی پارٹی اور افکار ونظریات بدلتے رہتے ہیں، اسی طرح بعض مصنفین اپنے اصول ومبادی کو چند سکوں میں فروخت کر دینا اور انہیں قربان کر دینا ذرا عیب نہیں سمجھتے۔

گذشتہ زمانہ میں تعلیم یافتہ طبقہ اپنے فکری اصول ومبادی کی خاطر جانی قربانیاں تک پیش کر دیا کرتا تھا، بہت سے قائدین ولیڈران اور ان کے پیروکاروں کو اسی کی خاطر

نذر آتش کر دیا گیا اور کتنوں کو تختۂ دار پہ چڑھا دیا گیا، ان کے یہاں افکار کے اظہار میں تردد و تذبذب عار کی بات سمجھی جاتی تھی، اس لیے آج کے ذہن و فکر اور عہد ماضی کے ذہن و فکر میں کوئی جوڑ ہی معلوم نہیں ہوتا، اس زمانے کے قائدین و مفکرین اصول کے اور مصنفین اپنی تحقیق کے پابند ہوتے تھے، ادب و صحافت میں بھی کردار کی تعمیر، انسانیت کی خدمت، وطن یا ملت کا مفاد ملحوظ ہوتا تھا، ایسے مصنفین کی ایک بڑی تعداد ملتی ہے جن کی نگارشات ان کی زندگی میں شائع ہی نہ ہو سکیں اور ان کی محنت کا ان کو کوئی مادی صلہ نہ ملا، مگر ان کا ضمیر اظہار خیال کر دینے کے بعد مطمئن ہو گیا۔

لیکن اس دور میں زندگی کے ہر میدان میں مادیت پرستی کا دور دورہ ہے، ہر قول و فعل کی بنیاد سیاسی و شخصی مصلحت ہو گئی ہے، راست گوئی کے مقابلے میں کذب و افتراء کا بازار گرم نظر آتا ہے، کسی بڑی شخصیت یا کسی بڑی تحریک و دعوت اور ادارہ کا محاسبہ کرنے اور بہتان لگانے کا ہر شخص اپنے کو اہل سمجھتا ہے، چاہے اس کا دامن کتنا ہی داغدار کیوں نہ ہو، آزادئ تحریر و تقریر اور وسائلِ نشر و اشاعت نے، خاص طور سے وسائل ابلاغ کی کثرت اور سوشل میڈیا کی سہولت نے اس کام کو اور آسان بنا دیا ہے، تقریر و تحریر کے اس غلط استعمال نے ذہنی بے راہ روی اور لوگوں کی حیرانی و پریشانی میں اضافہ کر دیا ہے، حیرت تو اس وقت ہوتی ہے جب کوئی صاحب قلم معاملہ کو بالکل پلٹ دیتا ہے، بعض اہل قلم کی نگارشات کا اگر ریکارڈ جمع کیا جائے تو عجیب و غریب ذہنی قلابازیوں کا مظاہر نظر آتا ہے۔ گویا صحافت کے میدان میں ہر شخص متہم نظر آتا ہے، جس طرح الیکشن میں ہر امیدوار مجرم نظر آتا ہے، اس لیے کہ ہر امیدوار دوسرے کو متہم ٹھہراتا ہے، اور عوام میں اس کے مجرمانہ رکارڈ کی تشہیر کرتا ہے، بالآخر وہ ٹراس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ تمام امیدوار خائن اور مجرم ہیں۔

احساسات و جذبات کی ترجمانی اور اظہار رائے کے مذکورہ بالا ذرائع کے علاوہ انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا (فیس بک، ٹویٹر، یوٹیوب اور واٹس اپ) نے ہر کس و ناکس کو اپنی بات

کہنے کا موقع فراہم کر دیا ہے، عالم و جاہل، بڑے بوڑھے، بچے جوان بلکہ طبقات انسانی کے ہر فرد کو اپنی بات کہنے اور دوسروں کی باتوں کو شیئر کرنے کا پورا موقع حاصل ہے، اس بے تحاشا آزادی کی وجہ سے ایسے واقعات پیش آرہے ہیں جن سے دوسروں کے جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے، یا دوسروں کے سیاسی نظریہ وفکر سے ٹکراتے ہیں، یا دوسروں کے مذہبی، یا قومی یا ملکی اقدار اور مسلمات سے متصادم ہوتے ہیں، اظہار رائے کے یہ وسائل کشمکش اور اختلاف کا سبب بن رہے ہیں، جس کے نتیجہ میں کبھی کبھی خونی تصادم اور فرقہ وارانہ فساد برپا ہو جاتا ہے۔

بہر حال اس زمانے میں تصنیف وتالیف کا کام بس ایک پیشہ بن کر رہ گیا ہے جب کہ یہ ایک بڑی ذمہ داری کا کام تھا اور اس کے لیے تحقیق وجستجو اور امانت داری کی ضرورت تھی، لیکن اس وقت وہ پراگندہ خیالی، ذہنی پریشانی کا سبب بن گیا ہے، یہ رجحان انتہائی خطرناک ہے، اس لیے کہ کتاب، رسالہ یا اخبار اپنی تاثیر میں مہلک ہتھیار سے کسی طرح کم نہیں، کیونکہ وہ ذہن سازی کا رول ادا کرتی ہے، اور ذہن ہی وہ قائد ہے جو انسانوں کو اسلحہ کے استعمال کا صحیح طریقہ بتاتا ہے، تو جب تک اس کے ساتھ بلند اصول، اعلی مقاصد اور صالح رہنمائی کا عظیم عنصر نہیں ہوگا وہ لوگوں میں خون خرابہ اور عناد ودشمنی کا بیج بوتا رہے گا جیسا کہ اس کے اثرات اس وقت ظاہر ہو رہے ہیں۔

کتابت وخطابت کا مسئلہ ایک مسلمان کے لیے جو آخرت اور روز جزاء پر ایمان رکھتا ہے، بڑی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ مسلمان کا عقیدہ ہے کہ اس دن ہاتھ پاؤں گواہی دیں گے اور زبانیں گنگ ہو جائیں گی اور ہر شخص کو اس کے کیے کا بدلہ دیا جائے گا، زبان سے نکلے ہوئے ہر ہر حرف پر گرفت ہوگی، لکھنے والا جو چاہے لکھتا رہے اور جس کو جو بولنا ہے وہ بول لے، لیکن یہ یاد رہے کہ اس کا بدلہ بہت جلد ملنے والا ہے، اللہ کے فیصلے سے اس کو کوئی ذات بچا نہیں سکتی۔

بعض اہل قلم عوام میں مقبولیت حاصل کرنے کے لیے اشتعال انگیز انداز کلام یا

انداز تحریر اختیار کرتے ہیں، ان کو اس سے مطلب نہیں ہوتا کہ ان کی تحریر یا تقریر کیا ردعمل پیدا کرے گی، اور اس کے کیا نتائج مرتب ہوں گے، انہوں نے اپنے افکار کو بکنے والا ایک سامان بنالیا ہے، وہ اپنی مقبولیت پر فخر کرتے ہیں، لیکن انہیں یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہئے کہ وہ جو کچھ لکھتے یا بولتے ہیں، وہ اللہ کے دفتر میں ریکارڈ ہو رہا ہے، اور اس کو ریکارڈ کرنے والے ایجنسیوں سے کہیں زیادہ مستعد و باریک ہیں، جو چھوٹی سی چھوٹی اور بڑی سے بڑی سب بات محفوظ کرتے جارہے ہیں اور روز جزاء میں پوری فائل حاضر کردیں گے، جس کے بارے میں قرآن میں ارشاد ہے ﴿ لَا يُغَادِرُ صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً إِلَّا أَحْصَاهَا وَوَجَدُوا مَا عَمِلُوا حَاضِراً ﴾. [سورہ کہف:۴۹] (کوئی چھوٹی بڑی چیز اس نے ایسی نہیں چھوڑی جو شمار نہ کی ہو، اور وہ اپنا سب کیا دھرا موجود پائیں گے)۔

خیر وشر کے درمیان فرق کرنے کی صلاحیت

صالح معاشرہ کی تشکیل کی بنیاد

موجودہ دور میں ''مادیت'' کے غلبہ کی وجہ سے انسانیت کو جو نقصانات ہو رہے ہیں، ان میں پہلا نقصان یہ ہے کہ انسان کی غیرت وحمیت ختم ہوتی جارہی ہے، قوانین وضوابط کی خلاف ورزی اور انسانی قدروں کی پامالی ہورہی ہے، موجودہ دور میں انسان کی ذہنیت یہ بن گئی ہے کہ اپنی عزت وغیرت کو داؤں پر لگا کر مال کما لیتا ہے، تو اپنے آپ کو بڑے فائدے میں گردانتا ہے، اس لیے کہ اس کا خیال ہے کہ مال تمام عیوب اور نقائص سے پاک کردیتا ہے، اسی مادی ذہنیت کی وجہ سے آج انسان عزت نفس، شرافت انسانی، غیرت وحمیت، حقوق کی پاسداری کے شعور واحساس سے بیگانہ اور خیر وشر کے درمیان فرق کرنے کی صلاحیت سے محروم ہوگیا ہے، اس کے نزدیک سود وزیاں، نفع ونقصان، عزت وشرافت اور قدر ومنزلت کا پیمانہ صرف مادی واقتصادی ترقی اور خوشحالی ہے، خواہ اس ترقی کے حصول میں دین واخلاق اور انسانی قدروں کا جنازہ ہی نکل جائے۔

مادی دنیا میں پنپنے والی یہ ذہنیت اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ آج کا مہذب انسان اپنے معاشی معیار کی بلندی کے لیے ہر چیز کو قربان کردینے کے لیے تیار ہے تاکہ اسے چند لمحوں کا ''عیش'' حاصل ہوجائے، جس کے لیے وہ رات دن ایک کردیتا ہے، اس مادی دنیا میں فخر ومباہات، عیش وعشرت اور لذت ومسرت کے وسائل حاصل کرنے کے لیے تن من دھن کی بازی لگائی جارہی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ مادی انسان کو صرف وہی شخص دکھائی دیتا

ہے، جو اس سے زیادہ اعلیٰ اور اس سے زیادہ مال ومنصب والا ہے، لیکن وہ ان اسباب ووسائل کو نہیں دیکھتا جن کے ذریعہ سامنے والے نے اس بلند مقام کو حاصل کیا ہے، اور نہ زندگی میں اس کے اخلاق ومعاملات اور سلوک کو دیکھتا ہے۔

موجودہ دور میں مادیت پسندی کی وجہ سے حقوق کے استحصال اور اخلاقی جرائم میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا ہے، عوام میں جتنا مادیت پسندی کا رجحان غالب آرہا ہے، اتنا ہی وہ ذہنی انتشار، بے چینی، محرومی اور بدبختی کا شکار ہورہے ہیں، مال ودولت کی بہتات نے مالدار شخص میں بدخلقی، بدمزاجی اور بدسلوکی پیدا کردی ہے، اور اس کی حرص وہوس میں مزید اضافہ کردیا ہے، اسی طرح مادی علوم وفنون کی کثرت نے معاشرہ میں نفع اندوزی، جعل سازی، دھوکہ دہی، حرام خوری، لذت کوشی، شراب نوشی اور قمار بازی جیسی مہلک بیماریاں پیدا کردی ہیں، دنیاوی ترقی نے جرائم کی انجام دہی کے لیے نئے نئے وسائل تلاش کرلیے ہیں، اصحاب اقتدار بزور قوت اپنے مجرمانہ منصوبوں کو نافذ کررہے ہیں، لوگوں کے دلوں اور ذہنوں میں اپنی دہشت اور رعب بٹھارہے ہیں، ان کے حقوق کا استحصال کررہے ہیں، ان کی آزادیاں سلب کررہے ہیں، اور ان کے جائز مطالبات پر ان کو پابند سلاسل کیا جارہا ہے اور ہولناک سزائیں دی جارہی ہیں، اس کے لیے ترغیب وترہیب اور ذہن سازی کے سارے وسائل استعمال کیے جارہے ہیں، اس رجحان کی وجہ سے ظالم مظلوم اور مظلوم ظالم بن گیا ہے، استحصال کا نام حصول حق اور ظلم کا نام اصلاح ہوگیا ہے اور مال کمانے کی ہوڑسی لگ گئی ہے حتی کہ مال دار طبقہ میں بھی کسب مال کی ریس جاری ہے، جس کے نتیجہ میں ترقی یافتہ طبقہ میں حرام خوری، مکاری، عیاری، خیانت، دھوکہ، مکروفریب، جعل سازی، رشوت اور سودخوری عام ہوگئی ہے، جس کے سبب آج زمین اس شخص کے لیے تنگ ہوگئی ہے، جس کی فطرت ان برائیوں کو قبول کرنے کے بجائے اللہ کے حدود پر قائم ودائم رہنا چاہتی ہے، اور حالات بھی ایسے شخص کے لیے سنگین ہوگئے ہیں جس کا ضمیر اس کو مادیت کو اپنانے کی اجازت نہیں دیتا، بلکہ وہ مادی طور طریقوں سے ہٹ کر

زندگی گزارنے کا خواہاں ہے، چنانچہ ایسے شخص کو اپنے حقوق کے حصول اور اپنی زیست کو خوشگوار بنانے کے لیے زندگی کے ہر موڑ پر مشکلات ومصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اس پر تعجب کسی کو نہیں ہوگا اگر یہ مادی رجحان اس مغربی تہذیب کے معاشرہ میں عام ہوجائے جس کی بنیاد مادیت ہے، جس کی روح اخلاقی اقدار سے بغاوت ہے، جس میں اچھائی اور برائی کے درمیان کوئی فرق ہی نہیں، بلکہ اس تہذیب کے علمبردار تو یہ کہتے ہیں کہ اچھائیاں اور برائیاں زمانہ، حالات، ماحول اور لوگوں کی خواہشات کے مطابق بدلتی رہتی ہیں، لہذا اس تہذیب میں نہ تو مسلمات ہی ہیں اور نہ ہی اقدار وروایات، بلکہ اس کی بنیاد مسلمات سے بغاوت اور ہر نئی چیز کو گلے لگالینا ہے، لیکن حیرت وتعجب کا مقام یہ ہے کہ زندگی کا یہ مادی رجحان عالم اسلام میں بھی پھیل گیا ہے۔

عالم اسلام کی تمدنی زندگی کا اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ عالم اسلام بھی مغرب کے نقش قدم پر چل رہا ہے، اس کا سبب نظام تعلیم وتربیت ہے، اور وہ اصحاب اقتدار ہیں جو مغربی ماحول کے پروردہ ہیں، اور یہ ان مادی متمدن ملکوں کی زندگی کو اختیار کررہے ہیں، جو اعلی اقدار سے عاری ہیں، اور یہ ان تمام لوگوں کو کچل رہے ہیں، جو معاشرہ کی صحیح انسانی خطوط پر تعمیر کے لیے کی کوشاں ہیں، اور سماج میں خیر وبھلائی اور امن وامان عام کرنے کے لیے تگ ودو کررہے ہیں، یہ مادی رجحانات وہ ذرائع ابلاغ پھیلا رہے ہیں، جن کی رسائی گھر گھر ہوچکی ہے بلکہ ہر فرد بشر ان کی زد میں ہے، جس کی وجہ سے یہ استحصالی اور مادی رجحان تیزی سے عام ہورہا ہے، جس کی وجہ سے آج اسلامی ممالک میں ظلم وجور، اور بدعہدی وبدخلقی جیسی خطرناک برائیاں جنم لے رہی ہیں، جو عالم اسلام کی پیشانی پر بدنما داغ ثابت ہورہی ہیں، حالانکہ اللہ تعالی نے عالم اسلامی کو اعلی اسلامی تعلیمات سے سرفراز فرمایا ہے، اور اس کی تاریخ شریفانہ انسانی زندگی، اعلی اخلاق، مثالی معاملات، ایثار وقربانی، ہمدردی وغمخواری اور فدائیت کے شاندار نمونوں سے بھری پڑی ہے، اس کے پاس خوشگوار

وپاکیزہ زندگی گزارنے کا عظیم سرمایہ ہے، جو خود دوسروں کے لیے باعثِ تقلید ہے، عالم اسلام کو تو مظلوموں اور مصائب سے دوچار لوگوں کا ملجا وماوی ہونا چاہیئے، اسے انسانی زندگی اور صالح معاشرہ کا بہترین نمونہ ہونا چاہیے، جو تمام خرابیوں اور برائیوں سے پاک وصاف ہو، جس میں ذمہ داری کا احساس جاں گزیں ہو، جس میں حقوق کی پاسداری ہو، جس میں بحیثیت انسان انسان کی عزت وشرافت محفوظ ہو، لیکن افسوس صد افسوس کہ موجودہ تہذیب وتمدن کی نقالی اور پرعیش مادی زندگی کے وسائل کی کثرت نے عالم اسلامی سے یہ قیمتی موقع چھین لیا ہے، آج اسلامی معاشرہ میں وہ تمام مہلک اخلاقی بیماریاں اور برائیاں موجود ہیں، جو مادی معاشرہ میں پائی جاتی ہیں، اور جو مسائل غیر اسلامی معاشرہ میں پائے جاتے ہیں وہ اسلامی معاشرہ میں بھی در آئے ہیں، اسی طرح مغربی سامراج کے پیدا کردہ فقر وفاقہ، ظلم وجہل اور پسماندگی بھی عام ہوگئی ہے۔

عالم اسلامی میں استحصالی ذہنیت اور مادی رجحان چھا گیا ہے، حکومتی اداروں اور زندگی کے دیگر شعبوں میں یہ ذہنیت صاف طور پر نظر آتی ہے، لاپرواہی، غفلت اور مصلحت پسندی کا مشاہدہ ہوتا ہے، ذمہ داروں کو کوئی شرم اور ہچکچاہٹ نہیں ہوتی، اور اگر مالی فائدہ نہ ہو تو مسائل کے حل کو پس پشت ڈال دیتے ہیں، یہ صورت حال غیر اسلامی معاشرہ سے مختلف نہیں، جو بھی اسلامی ملکوں کا سفر کرتا ہے، وہ عالم اسلام اور دیگر ملکوں کے درمیان اخلاق وکردار، عیش وعشرت، اور حکام، امن وامان کے ذمہ دار اور افسران کے رویے میں کوئی فرق نہیں پاتا، وہ تو صرف ایک طوفان بلاخیز دیکھتا ہے، جس نے بغیر کسی تفریق کے مشرق ومغرب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے، اگر عالمِ اسلام کے ذمہ دار اسلامی اخلاق اور اخلاقی معاملات کے مختلف نمونے دنیا کے سامنے پیش کرتے، تو وہ ان مرشدین ومصلحین کے مقام تک پہنچ جاتے، جنہوں نے گھٹا ٹوپ تاریکی میں دبی کچلی انسانیت کی مسیحائی ورہنمائی کی، آج بھی ملت اسلامیہ ایسے افراد سے خالی نہیں ہے، لیکن ملت کے افراد میں

جرأت وہمت اور استقلال وثبات کی کمی ہے، اور صحیح دینی ودعوتی تربیت کا فقدان ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی صحیح تربیت ورہنمائی اور ان کی حوصلہ افزائی کی جائے، ان احساسات کا اظہار یورپ میں بسنے والے ان لوگوں نے خاص طور پر کیا ہے، جو اسلامی تعلیمات کا مطالعہ کر کے مشرف بہ اسلام ہوئے، پھر جب انہوں نے اسلامی ملکوں کا سفر کیا، تاکہ وہاں کے خوشگوار وپاکیزہ ماحول اور ربانی فضا میں اپنی زندگی گزار سکیں، تو انہیں بہت افسوس اور مایوسی ہوئی، ان کو بڑا صدمہ ہوا کہ یہاں بھی مغربی کلچر وثقافت کی تمام برائیاں موجود ہیں، اسی طرح مسلم خاندانوں میں شادی کر کے انہیں اس کا تلخ تجربہ ہوا۔

اگر اسلامی اخلاق اور دینی اقدار پر زندگی کی تعمیر کا کام کیا جائے، تو اس عمل کا کسی مفاد سے ٹکراؤ نہیں ہوگا، اور نہ ہی کسی حکومت یا نظام سے کوئی اختلاف ہوگا، ضرورت اس بات کی ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ اور نوجوانوں کو ان کی ذمہ داریوں کا احساس دلایا جائے، یہ عمل ایک تعمیری اور مثبت اقدام ہوگا، اور اسلامی تنظیمیں اور ادارے اس عمل کو اپنی سرگرمیوں کا حصہ بنا سکتی ہیں، اور یہ دین وملت کی اچھی خدمت ہوگی، اور یہ عمل سیاسی جد وجہد، اقتدار وحکومت کے حصول اور سیاسی زندگی میں حصہ داری سے زیادہ اہم ہے، جیسا کہ قرآن کریم نے اس طرف اشارہ کیا ہے "فلو لا نفر من كل فرقة منهم طائفة ليتفقهوا في الدين ولينذروا قومهم إذا رجعوا إليهم لعلهم يحذرون" چاہئے کہ تم میں کچھ لیسے بھی لوگ ہوں جو دین کو خوب اچھی طرح سمجھیں اور پھر جب یہ لوگ اپنی قوم کی طرف لوٹیں تو اپنی قوم کو اللہ سے ڈرائیں تاکہ وہ لوگ اللہ سے ڈرنے والے بن جائیں۔

امام احمد بن عرفانؒ نے اللہ کے راستہ میں جہاد کیا حتی کہ خداوند قدوس نے انہیں شہادت نصیب فرمائی، انہوں نے ایک اسلامی حکومت قائم کی، اور اصلاح معاشرہ کے لیے اپنی تمام کوششوں کو صرف کر دیا، وہ جہاد میں مشغولیت کے باوجود بھی مصلحین اور مرشدین کی جماعتوں کو معاشرہ کی اصلاح کے لیے بھیجتے تھے، چنانچہ ان کے مصلحین اور مرشدین

ہندوستان کے مختلف گوشہ میں پھیل گئے، اور زیادہ سے زیادہ دینی مدارس کا قیام عمل میں آیا، لاکھوں افراد کی زندگی میں انقلاب آیا، ان کے رفقاء کے ہاتھوں پر ہزاروں افراد نے اسلام قبول کیا، اور سچی توبہ کر کے دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے، اور معاشرہ میں اسلامی تعلیمات اور دینی وشرعی معاملات کا خوب رواج ہوا۔

موجودہ دور بھی ایسے مصلحین ومرشدین کا تقاضا کر رہا ہے، جو تغیر پذیر معاشرتی حالات کا ڈٹ کر سامنا کریں، اور وہ مغربی ومادی رجحانات کو بدلنے کے لیے اسلامی اخلاق وکردار کا اعلیٰ نمونہ پیش کریں۔

موجودہ وقت میں معاشرہ کی اسلامی بنیادوں پر تعمیر کا کام ملت کے دوسرے کاموں سے زیادہ اہم اور فوری توجہ کا طالب ہے، اس لیے کہ سماج ہر کوشش کی بنیاد اور اس کا نقطۂ آغاز ہے، اور اسلامی بنیادوں پر اسلامی معاشرہ کی اصلاح کیے بغیر کوئی بھی کوشش کبھی ثمر آور نہیں ہو سکتی۔

موجودہ حالات ایسی تحریک کے متقاضی ہیں جو ان تمام سماجی امراض کا قلع قمع کر سکے، جو حقیقت میں اسلام کی روح اور دینی تعلیمات کے خلاف ہیں، چنانچہ احادیث مبارکہ میں بھی ان تمام معاشرتی امراض اور خرابیوں کو بالکل واضح طور پر بیان کر دیا گیا ہے، اور سخت لہجہ میں ڈرایا گیا ہے، لہٰذا علماء امت کو اس طرف توجہ کرنے کی بہت ضرورت ہے، تاکہ اسلامی معاشرہ انفرادی واجتماعی زندگی میں دوسری قوموں کے معاشروں سے ممتاز ہو، مزید یہ کہ اس اصلاحی اور دعوتی کام کے لیے نظام حکومت میں دخل اندازی کی ضرورت نہیں، بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ اصلاح ودعوت کا کام کرنے والوں کے رویہ اور طریقہ کار میں تبدیلی آجائے اور ان کے اندر ذمہ داریوں کا احساس وشعور پیدا ہو جائے۔

عہد نو کی آمد

انیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں پوری دنیا، خصوصا دنیا کے وہ حصے جو یورپ کی سیاسی اور علمی یلغار کا شکار تھے، وہ یورپ کی چمکتی دمکتی تہذیب اور روشن تمدن سے مسحور ہو گئے، اور یورپ کی مادی اور علمی ترقی نے ان کو زیادہ متاثر کیا، اس لیے کہ اس وقت دنیا کے دیگر حصوں میں جہالت پھیلی ہوئی تھی اور اقتصادی پسماندگی اور فقر و فاقہ عام تھا، اور اس صورت حال سے مسلم اکثریت والے ممالک زیادہ دوچار ہوئے، سب سے پہلے شام اور مصر جو یورپ کی زد پر تھے، اس فکری اور مادی یلغار کا نشانہ بنے، اور ان مسلم ملکوں کے جو افراد یورپ تعلیم حاصل کرنے گئے وہ یورپ کے تمدن سے مرعوب ہو کر واپس ہوئے، بلکہ اس زمانہ میں جو بھی یورپ گیا وہ وہاں کی مادی، علمی ترقی اور زندگی کی ظاہری چمک دمک سے متاثر ہو ہی کر لوٹا اور اپنے ملک میں یورپ کے گن گائے اور اپنی تحریر و تقریر کے ذریعہ یورپ کی اندھی تقلید کی دعوت دی، اخبارات و رسائل میں مضامین شائع کیے اور دیگر وسائل نشر و اشاعت کے ذریعہ زندگی کے تمام میدانوں میں مغرب اور اہل مغرب کی برتری اور تفوق کو پیش کیا، مغربیت پسندوں کے زبردست پروپیگنڈہ کے شور میں یورپی تمدن کے دوسرے تاریک اور مہلک پہلو نظروں سے اوجھل ہو گئے، حالانکہ زندگی صرف مادی اور علمی ترقی و دولت کا نام نہیں ہے، بلکہ زندگی عبارت ہے انفرادی، اجتماعی، عائلی اور سماجی قدروں سے، انسانی سلوک سے اور کائنات اور انسان کے متعلق اعلی تعمیری تصور سے۔

مسلم ممالک کے مغربی تعلیم یافتہ حضرات کی غلامانہ ذہنیت، احساس کمتری اور مغرب کے تفوق و بالادستی کا تاثر ان کتابوں میں دیکھا جا سکتا ہے جو انیسویں صدی کے

اوائل میں شائع ہوئیں۔

مغربی مفکرین اور اہل قلم نے اس غلامانہ ذہنیت اور تأثر سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسلام اور دیگر مذاہب پر حملہ شروع کر دیا اور بڑی قوت کے ساتھ یہ باور کرایا کہ مذہب مادی ترقی اور علمی بحث وتحقیق کے راستہ کا سب سے بڑا روڑا ہے، اس فکری اور تہذیبی یلغار نے مغربی تمدن کے دیوانوں اور شیدائیوں میں الحادی سوچ پیدا کر دی، اس یلغار کا اثر سب سے زیادہ عالم عربی پر پڑا، اس لیے کہ یہ مغربی دنیا کی زد پر تھا، اور صلیبی حملوں سے دوچار تھا اور مغرب سے براہ راست اختلاط بھی اس میں معاون ثابت ہوا۔

مغربی تعلیم یافتہ حضرات کا یہ تأثر نشأۃ ثانیہ سے پہلے صلیبیوں کے تأثر کے بالکل مماثل تھا، کیونکہ نشأۃ ثانیہ سے پہلے مغرب بھی اسی طرح کی صورتحال سے دوچار تھا، خود مغربی مؤرخین کا اعتراف ہے کہ بارہویں صدی سے پہلے یورپ گھٹاٹوپ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا، علم ودانش سے کوسوں دور تھا اور اقتصادی اعتبار سے انتہائی پسماندہ تھا، جبکہ دوسری طرف عالم اسلام میں قریہ قریہ قصبہ قصبہ بڑے بڑے کتب خانوں، دانشوروں اور محققین سے معمور تھے، عالم اسلام میں علم وفن کی محفلیں گرم تھیں، اور تشنگان علم وہنر اپنی پیاس بجھانے کے لیے دنیا کے کونے کونے سے عالم اسلام کا رخ کر رہے تھے، اس لیے کہ وہی اس عہد میں علم ومعرفت کا چشمہ اور مرکز تھا، ایشیائے کوچک اور یورپ کے جویانِ علم چھپ چھپ کر بغداد، بصرہ، قاہرہ اور قرطبہ آتے اور اپنی علمی تشنگی دور کرتے تھے، اور اس وقت یورپ میں علم کے دروازے بند تھے، علم پر پابندی تھی اور ارباب کلیسا کی اجارہ داری تھی، دوسری طرف عالم اسلام میں علم وہنر کی روشنی پھوٹ رہی تھی، بازار آباد تھے، تجارت وزراعت، صنعت وحرفت اور معیشت کا بازار گرم تھا، سفر کے وسائل کی بہتات اور راستے پرامن تھے، جبکہ یورپ میں تاریکی ہی تاریکی تھی، پرامن راستے ندارد تھے، علاج ومعالجہ کے وسائل مفقود تھے، یورپ میں جو کچھ علم وہنر ہے وہ سب مسلمانوں کا ہی مرہون منت ہے، یورپ میں علم کا آغاز صلیبی جنگوں کے دوران مسلمانوں کے علوم وتمدن سے واقفیت کے

بعد ہوا، مغرب کے انصاف پسند دانشوروں کا اعتراف ہے کہ یورپ میں علم وہنر اور تمدن مسلم ملکوں سے ہی آیا ہے، ایک مغربی مفکر کہتا ہے کہ اگر مسلمانوں کے علوم نہ ہوتے تو یورپ تین سو(۳۰۰) سال اور پیچھے چلا جاتا، فرنچ مصنف گستاؤ لیبان نے اپنی کتاب ''تمدن عرب'' میں لکھا ہے کہ ''عرب یورپ کے معلم اول ہیں''۔

لیبان مزید لکھتا ہے:۔

''عربوں نے جو مستعدی علم میں ظاہر کی، وہ فی الواقع حیرت انگیز ہے، اس خاص امر میں بہت سی اقوام ان کی ہمسر ہوئی ہیں، لیکن بمشکل کوئی ان سے بازی لے جاسکی، جب وہ کسی شہر کو لیتے تو پہلے وہاں مسجد اور مدرسہ تعمیر کرتے، بڑے شہروں میں ان کے مدارس ہمیشہ بکثرت ہوتے تھے۔

بنجمن دلی تودیل متوفی ۱۱۷۳ء بیان کرتا ہے کہ اس نے اسکندریہ میں بیس مدرسے دیکھے۔

علاوہ عام علمی مدارس کے بغداد، قاہرہ، طلیطلہ، قرطبہ وغیرہ بڑے شہروں میں دار العلوم تھے جن میں علمی تحقیقات کے کارخانے، رصد خانے، عظیم الشان کتب خانے، شعبہ جات تھے، صرف اندلس میں ستر (۷۰) عام کتب خانے تھے۔

مؤرخین عرب کے اقوال کے بموجب خلیفہ الحکم ثانی کے کتب خانہ میں جو قرطبہ میں تھا چھ لاکھ جلدیں تھیں، جن میں سے چوالیس جلدوں میں صرف فہرست کتب تھی، اس کے متعلق کسی نے بہت درست کہا ہے کہ چار سو برس بعد جب فلسفی چارلس نے فرانس کے شاہی کتب خانہ کی بناڈالی تو وہ نوسو(۹۰۰) جلدوں سے زیادہ جمع نہ کرسکا اور ان میں سے کتب مذہبی کی ایک پوری الماری بھی نہ تھی''۔ (تمدن عرب، اردو ترجمہ از سید علی بلگرامی، ص:۳۹۸-۳۹۹)۔

تاریخ سے ناواقفیت فریفتہ یان یورپ میں احساس کمتری اور شکست خوردگی کی ذہنیت پیدا کرتی ہے، اسلام جہالت کا سبب نہیں ہے بلکہ اسلام علم وہنر کا منبع اور پاسباں

ہے، لیکن جب سے مسلمانوں نے علم ودانش کے میدان میں محنت کرنا چھوڑ دیا اور علم سے کنارہ کشی اختیار کر لی، پستی اور ذلت کا شکار ہو گئے، دوسری طرف یورپ نے علم کا راستہ اختیار کیا اور بام عروج کو پہنچ گیا، اللہ کی سنت جاریہ بھی یہی ہے، لہذا تاریخ کی گاڑی ہمیشہ رواں دواں رہتی ہے، اور مسافر چڑھتے اترتے رہتے ہیں۔

مغربی (برطانوی) سامراج کے زمانہ میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ سامراج ایک حقیقت ہے اور سامراجی طاقتیں اپنی طاقت وقوت، وسائل اور اپنی تدبیر وسیاست کی بنا پر ہمیشہ باقی رہیں گی، اگر کوئی سامراج سے آزادی اور غلامی کے ختم ہونے کی بات کرتا تو جدید تعلیم یافتہ حضرات اور دانشور اس کا مذاق اڑاتے، اور یہ کہا جانے لگا تھا کہ انگریز جنہوں نے جرمنی کو شکست دیدی انہیں یہ نہتے جہلاء آزادی کی لڑائی لڑنے والے کیسے شکست دے سکتے ہیں، دوسری طرف برطانیہ آزادی کی تحریک کو کچلنے کے لئے اپنے سارے وسائل استعمال کر رہا تھا، لیکن پچاس سال کے اندر ہی برطانیہ کو ہندوستان سمیت دیگر ایشیائی اور افریقی ممالک سے نکلنا پڑا، اور تمام ممالک آزاد ہو گئے جو مغربی سامراج کے ماتحت تھے، اور سو سال کے اندر تاریخ کا نقشہ اور دنیا کے حالات بدل گئے۔

برطانیہ کے تعلق سے مشہور تھا کہ اس کا رقبہ اتنا وسیع ہے کہ سورج اس کی مملکت میں غروب نہیں ہوتا، اور اسے ''مملکت عظمی'' کہا جاتا تھا، لیکن آج اس کا رقبہ سمٹ گیا ہے اور قریب ہے کہ کئی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ جائے، اس لیے کہ اسکاٹ لینڈ اور آئرلینڈ میں برطانیہ سے الگ ہونے کی تحریکیں زوروں پر ہیں، اور عنقریب ایک ذیلی اسٹیٹ بن کر رہ جائے گا، اگر چہ امریکہ کی مدد سے سلامتی کونسل میں اپنی کرسی بچائے ہوئے ہے۔

اسی طرح فرانس جو ایک زمانہ میں پوری دنیا کا حکمراں بن گیا تھا، اور یورپ کے لیے خطرہ سمجھا جانے لگا تھا، اور الجزائر کو اپنے ملک کا ایک اٹوٹ حصہ سمجھتا تھا، اور تحریک آزادی کو کچل کر رکھ دیا تھا، لیکن بالآخر اسے بھی رسوا ہو کر وہاں سے بھاگنا پڑا، بلکہ دوسری تمام کالونیوں سے بھی دست بردار ہونا پڑا۔

اسی طرح کا انجام جرمنی کا بھی ہوا جس نے ایک زمانہ میں پوری دنیا پر خوف ودہشت طاری کردی تھی، اور حالیہ عہد میں سویت یونین کا بھی یہی برا حشر ہوا، کہ کبھی تو اس کا پوری دنیا میں طوطی بولتا تھا، پوری دنیا اس کے زیر نگیں تھی، لیکن وہ بھی ٹوٹ گیا اور اس کا شیرازہ منتشر ہوگیا۔

موجودہ سپر پاور امریکہ بھی زبردست اقتصادی بحران سے دوچار ہے، اسی وجہ سے وہ ان ملکوں سے نکلنے کی کوشش کررہا ہے جہاں اس کا قبضہ ہے، اور دنیا کے مختلف حصوں میں اپنی بالادستی باقی رکھنے کی جو ظالمانہ کارروائیاں کی ہیں اس سے اس کی شبیہ اور خراب ہوگئی اور عنقریب اس کا بھی انجام وہی ہونے والا ہے جو سابقہ ظالم قوموں اور طاقتوں کا ہوا ہے۔

﴿وکم أهلكنا قبلهم من قرن هل تحس منهم من أحد أو تسمع له ركزا﴾[سورہ مریم:۹۸] (اور ہم نے اس سے قبل کتنے ہی گروہوں کو ہلاک کردیا، سو آپ ان میں سے کسی کو دیکھتے ہیں یا ان کی آہستہ آواز بھی سنتے ہیں؟)۔

قرآن کریم میں اقوام وملل کے عروج وزوال، تاریخی انقلابات اور زندگی میں تغیر وتبدیلی کا تذکرہ واضح الفاظ میں ملتا ہے، قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ انسانی میں مختلف قومیں بام عروج پر پہنچی اور پھر پستی اور زوال کا شکار ہوگئیں، نہ تو کسی کو بقاودوام حاصل رہا اور نہ ہی کوئی ہمیشہ پستی وادبار کا شکار رہا، جو بھی بلندی اور غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کے اسباب وسائل اختیار کرتا ہے وہ غلبہ حاصل کرلیتا ہے۔

قرآن کریم میں قوموں، طاقتوں کے نظام اور طاقت کے توازن میں اس بنیادی تبدیلی کا تذکرہ بار بار آیا ہے کہ قوت وطاقت، پستی وکمزوری، علم وجہالت اور دولت وفقر کے پیمانے بدلتے رہے ہیں، ایک مسلمان کا عقیدہ یہ ہے کہ کائنات کا پورا نظام اللہ تعالی کے ہاتھ میں ہے، وہ جس کی چاہتا ہے مدد کرتا ہے، جسے چاہتا ہے عزت وسربلندی دیتا ہے، اور جسے چاہتا ہے ذلیل ورسوا کردیتا ہے، دنیا کے موجودہ حالات وواقعات اور انقلابات اس حقیقت کی تصدیق کررہے ہیں، کہ بہت سے ڈکٹیٹر، مطلق العنان حکمراں اور ظالم وجابر حکام جو برسہابرس اپنی قوموں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑتے رہے، عبرت ناک انجام سے گزررہے ہیں، اور جو مظلوم

تھے وہ اب برسر اقتدار آرہے ہیں، اور یہی انجام ہر ظالم وجابر کا ہوگا، حق غالب آئے گا اور مظلومین کو آزادی اور غلبہ نصیب ہوگا، تاریخ کا یہی بے لاگ فیصلہ ہے اور روئے زمین پر اللہ کی سنت جاریہ بھی یہی ہے، لہٰذا پوری دنیا کے مظلومین اور حق کی لڑائی لڑنے والوں کو خوشخبری ہو۔

حالیہ وقت میں طاقت وقوت کی میزان میں تبدیلی اور عروج وزوال کی تازہ مثال ان مظلومین کا کرسی اقتدار پر فائز ہونا ہے جنہوں نے طویل مدت پس زنداں اور سلاخوں کے پیچھے گزاری ہے، اور لمبے عرصے سے ایمرجنسی اور مارشل لا کے حالات میں سانسیں لے رہے تھے، اب ایمرجنسی ختم کردی گئی ہے جیسا کہ مصر میں اعلان کیا گیا کہ تیس سالوں سے نافذ ایمرجنسی کو ختم کیا جاتا ہے، لیکن اب جنہیں موقع مل رہا ہے ان کی ذمہ داری ہے کہ اس حقیقت کو پیش نظر رکھیں کہ بقاودوام تو صرف حق وانصاف اور عدل کو حاصل ہے، ظلم وبربریت کی ناؤ سدا نہیں چلتی، اسی طرح انانیت، خودسری اور فیصلہ کرنے میں عجلت پسندی بھی مفید نہیں ہوتی، اسلامی تعلیم اور اسلامی تاریخ سے بھی یہی سبق ملتا ہے کہ قدرت کے وقت معافی اور عفوودرگزر کرنا چاہیے، اور اس تبدیلی اور تجربہ سے پوری دنیائے انسانیت کو خوشی ہوگی، لیکن اس کا دارومدار نئے حکام کے سلوک واخلاق، دوست ودشمن کے ساتھ معاملہ اور مسائل حل کرنے کے سلسلہ میں ان کے طریقۂ کار پر ہے۔

دنیا نے بارہا مشاہدہ کیا ہے کہ منصۂ شہود پر قومیں بڑے کروفر کے ساتھ آئیں، ظلم کے پہاڑ توڑے، اور تہذیبیں آئیں اور فساد برپا کیا، لیکن ان کا انجام ایسا عبرتناک ہوا کہ اب ان کا نام ونشان بھی باقی نہیں رہا، اب دنیا کو ایسی طاقت کا انتظار ہے جو انسانوں میں عدل وانصاف کا پرچم بلند کرے، خیر وبھلائی اور امن وآشتی عام کرے، اس لیے کہ لوگوں کے کرتوتوں کی وجہ سے پوری دنیا میں بدامنی، کرپشن اور ظلم وزیادتی کا دور دورہ ہے۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:۔

''قیادتیں (لیڈرشپ) سمندر کی ان موجوں کی طرح ہیں، جو آتی جاتی رہتی

ہیں، وہ کبھی کبھی تیز اٹھ کر اپنے وجود کا اعلان کرتی ہیں، بعض اوقات کسی جہاز یا کشتی کو ہلا کر رکھ دیتی ہیں اور ڈبو دیتی ہیں، لیکن بالآخر اس بحر زخار میں گم ہو جاتی ہیں، اور ان کا پتہ بھی نہیں لگتا، لیکن سمندر اسی طرح باقی رہتا ہے، اور کسی وقت اپنے وجود، اپنی شخصیت اور اپنے صفات واثرات سے محروم نہیں ہوتا۔

تاریخ میں ہمیں ان غضبناک موجوں کا بار بار مشاہدہ ہوا ہے، ان میں بعض موجیں تو اتنی بلند ہوئیں کہ انہوں نے آسمان کو چھولیا، لیکن اس کے بعد اسی سمندر کی تہ میں ہمیشہ کے لیے سو گئیں، کتنی حکومتیں قائم ہوئیں، کیسی کیسی قیادتیں ظاہر ہوئیں، لیکن دیکھتے ہی دیکھتے ان کی بساط الٹ گئی، البتہ اسلام اسی طرح زندہ وتابندہ ہے، امت بھی وہی ہے، اس کا پیغام بھی وہی ہے، قرآن بھی وہی ہے اور ایمان بھی وہی۔

یہ حوادث وانقلابات اور یہ نشیب وفراز وہ قدرتی تجربات ہیں، جن سے دنیا کی زندہ اور بیدار قومیں ہمیشہ گزرتی ہیں، یہ وہ آزمائشیں اور امتحانات ہیں، جن سے کھرے کھوٹے کا فرق معلوم ہوتا ہے اور قوم کی پختگی کا اندازہ ہوتا ہے، ان کی بدولت وہ تکلیف وراحت، ترقی وشدت، ہر حالت کی عادی ہوتی ہیں، وہ فتح کے وقت غرور میں مبتلا نہیں ہوتیں اور ناکامی اور ہزیمت کے بعد مایوسی کا شکار نہیں ہوتی ہیں ﴿لکیلا تأسوا علی ما فاتکم ولا تفرحوا بما آتاکم﴾ [سورہ حدید:۲۳] (تاکہ نہ متأسف ہو تم اس چیز پر جو تمہارے ہاتھ سے نکل گئی اور نازاں نہ ہو اس پر جو تمہیں دیدی گئی ہے)۔

اس کی مثال اس زندہ اور صحت مند وتوانا جسم کی ہے جس کی قوت مدافعت اور قوت برداشت کا صحیح اندازہ اسی وقت ہوتا ہے جب وہ صحت ومرض، ضعف وقوت، آب وہوا کے اختلاف، موسموں کے تغیر اور اس طرح کی تمام چیزوں پر فتح حاصل کر لیتا ہے اور ہر قسم کے تلخ وترش کا عادی ہوتا ہے، جس طرح ایک صحت مند جسم کے لیے صحت کی ضمانت ہے خواہ اس کو درمیان میں ان تمام مراحل سے گزرنا پڑے اسی طرح انسانیت کے لیے

بہترین پیغام رکھنے والی اور ان صفات وخصوصیات کی حامل قوم کے لیے (جو سارے عالم کے لیے باعث خیر وسرچشمۂ ہدایت ہے) فتح ونصرت بھی مشیت الٰہی ہے، اور قرآن مجید اس کی فتح کی ضمانت ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

﴿قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ، هَذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِينَ، وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ، إِن يَمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهُ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَتَّخِذَ مِنكُمْ شُهَدَاءَ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ، وَلِيُمَحِّصَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَمْحَقَ الْكَافِرِينَ﴾ [سورہ آل عمران: ۱۳۷-۱۴۱]

(تم سے پہلے بھی سنت الٰہی کے بہت سے واقعات گزرے ہیں، سو گھومو پھرو روئے زمین پر اور پھر دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا، یہ وضاحت ہے لوگوں کے لیے اور ہدایت ونصیحت ہے خاص اہل تقوی کے لیے اور تم نہ پست ہمت ہو اور نہ رنجیدہ کہ تم ہی سربلند رہنے والے ہو اگر تم میں ایمان ہے، اگر تمہیں زخم آئے ہیں تو دشمن کو بھی اسی طرح زخم پہنچا ہے اور یہ دن تو ہم اسی طرح لوگوں کے درمیان ادلتے بدلتے رہتے ہیں اور اس سے یہ بھی مقصد ہے کہ اللہ ایمان والوں کو دیکھ لے اور تم میں سے بعض کو شہید بنادے، اللہ ظالموں کو نہیں پسند کرتا ہے اور تاکہ پاک صاف کردے اہل ایمان کو اور مٹادے کفر کرنے والوں کو)۔

امن وامان کے نام نہاد داعیوں کے عہد میں امن وآشتی مفقود ہے، اور ترقی یافتہ سماج میں انسان لوٹ کھسوٹ، محرومی اور بدبختی کا شکار ہے، دنیائے انسانیت کو ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو انسانیت کی امیدوں اور تمناؤں کو پورا کریں، انسانیت کی ڈوبتی نیا کو پار لگائیں، اور ایک نئی تاریخ اور نئے عہد کا آغاز کریں۔

نئے نظام کے قیام کا نیا سامراجی منصوبہ

دنیا کا سیاسی نقشہ بڑی تیزی سے بدل رہا ہے، اس موجودہ منظر نامہ کو ''نظامہائے حکومت کی تبدیلی'' کا نام دے سکتے ہیں، ''نیا عالمی نظام'' (New World Order) کا نعرہ سب سے پہلے سابق امریکی صدر بش نے اپنے عہد اقتدار میں بلند کیا تھا جس کے بعد مغربی سامراج نے مختلف ملکوں میں نظام حکومت بدلنے کی کوشش کی اور اپنے موافق مہرے بٹھائے اور اس مقصد کے حصول کے لئے اپنے ناپسندیدہ حکمرانوں کے خلاف عوامی بغاوتیں کرائیں۔ موجودہ وقت میں عوامی انقلاب کی طوفانی آندھیوں کا پہلا نشانہ تونس اور پھر مصر بنا، بحرین بھی اس کی زد میں آیا، پھر یمن و شام اس بغاوت کی زد میں آئے اور اطلاعات کے مطابق شام میں ابھی تک موجودہ نظام کے خلاف مظاہرے اور پرتشدد احتجاج جاری ہیں۔ مصر و تونس میں مدت دراز سے قائم استبدادی نظام ختم ہو گیا اور موروثی حکمرانوں کو اقتدار سے بے دخل ہونا پڑا، جو تیس سال سے کرسی اقتدار پر قابض تھے، اور اپنے آپ کو مطلق العنان فرمارواسمجھتے تھے اور اس بات کا مظاہرہ کرتے تھے کہ وہ ملک کے دستور و آئین کی بنیاد پر قوم کے منتخب نمائندے ہیں اور ہر الیکشن میں ان کی مدت اقتدار کی توسیع ہو جاتی تھی، اس طرح اقتدار میں باقی رہنے کا موقع انہیں بآسانی ہاتھ آجاتا تھا، اس لئے کہ ملک کے آئین میں ان کی مدت اقتدار کی توسیع و تجدید پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں، اقتدار کے بقاو تحفظ کی اس پالیسی پر کسی سیاسی ادارہ اور بین الاقوامی دستور ساز تنظیموں کو حتی کہ یورپی ممالک کو بھی کبھی کوئی اعتراض نہیں ہوا، جن کے نزدیک اقتدار تک پہنچنے اور اسے قائم رکھنے کا یہ ایک کارگر حربہ ہے، لیکن اچانک ان ملکوں میں یورپی ممالک اور خاص طور

سے امریکہ کے حلیف حکمرانوں کے خلاف بغاوت کا ایک سیلاب آتا ہے اور آن کی آن میں ان کی حکومت کا شیرازہ تارِعنکبوت کی طرح بکھر جاتا ہے حالانکہ ان حکمرانوں کو یورپ بلکہ امریکہ کی بھرپور تائید اور حمایت حاصل تھی۔

بالآخر انقلاب و بغاوت کی اس آندھی نے لیبیا کا رخ کیا اور آج بھی وہاں انقلابیوں اور استبدادی نظام کے درمیان خونی تصادم جاری ہے، سیکڑوں جانیں اس کی وجہ سے لقمۂ اجل بن رہی ہیں، اس نام نہاد عوامی انقلاب نے باقاعدہ مسلح جنگ کی شکل اختیار کر لی ہے، امریکہ، فرانس، برطانیہ اور یورپ کے دیگر ممالک کی جانب سے ۳۵ رسال سے قائم آمرانہ نظام سے عوام الناس کی جان و مال کے تحفظ کے لئے انقلابیوں کی حمایت اور مدد کی جارہی ہے، اور ناٹو کی بمباری جاری ہے، لیکن اب تک حالات میں کسی خوشگوار تبدیلی کے آثار نظر نہیں آتے، باہم تبادلۂ خیال اور گفتگو کا سلسلہ تاہنوز قائم ہے، کسی معاہدہ پر ایک فریق اگر رضامندی کا اظہار کرتا ہے تو دوسرا اس سے انکار، ہاں اتنا ضرور ہوا کہ اس انقلاب نے لیبیا میں سامراجی ممالک کو قدم جمانے کے مواقع فراہم کردئے، سامراجی ممالک کی اسی بیجا مداخلت، زبردستی کے تعاون اور ''مگرمچھ کے آنسو بہانے'' (Crocodile Tears) پر بعض حلقوں نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے، اس لئے کہ یہ پورا انقلاب درحقیقت سامراجی مقاصد کی تکمیل کا ایک نیا سامراجی منصوبہ ہے۔

عالم اسلام میں ہونے والے موجودہ انقلاب سے ۱۹۵۶ء میں مصر کا وہ انقلاب یاد آتا ہے جب مصر کے صدر جمال عبدالناصر نے نہر سویز کو نیشنلائز کرنے کا قدم اٹھایا تو برطانیہ، فرانس اور اسرائیل نے مل کر مصر پر حملہ کر دیا تھا، اگر سویت یونین کی مخالفت اور اس کی طرف سے فوری جنگ بندی کی دھمکی نہ ہوتی تو بہت ممکن تھا کہ مصر ایک مرتبہ پھر سامراجیت کے زیر نگیں آجاتا، جس کے ظالمانہ پنجوں سے بڑی قربانیوں کی بعد اس نے آزادی حاصل کی تھی، کیونکہ فضائی حملوں کے ذریعہ حملہ آور ممالک نے مصر کی حساس اور اہم

جگہوں پر اپنا تسلط قائم کرلیا تھا، چونکہ سویت یونین اس وقت امریکہ کی طرح سپر پاور تھا، پوری دنیا میں اس کی سطوت و ہیبت قائم تھی، اور دوسری دنیا کا نمائندہ سمجھا جاتا تھا، چنانچہ روسی صدر بلکانین نے حملہ آور ممالک کو دھمکی دی کہ ۱۲ر گھنٹہ کے اندر اپنی فوجیں مصر سے ہٹا لیں، ورنہ اس کا رخ پیرس ولندن کی طرف ہوگا اور ایک نئی عالمی جنگ کی شروعات ہوگی۔ روسی صدر کی اس دھمکی کے فوراً بعد جنگ بند ہوگئی اور امریکہ نے عالمی جنگ کے خوف سے جسے ابھی ۱۰ر سال ہی ہوئے تھے، مصری سرحدوں سے فوجوں کو ہٹا لینے کی ذمہ داری لی، اور جمال عبدالناصر اس سہ ملکی حملہ سے کامیاب نکلنے کے بعد ہیرو بن گئے۔

فتح حاصل کر لینے کے بعد جمال عبدالناصر نے جب ہندوستان کا دورہ کیا تو ان کا بہت شاندار استقبال ہوا، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے انہوں نے بڑی طاقتوں کو شکست فاش دی ہو، اس لئے کہ ان سامراج مخالف ممالک میں سامراجیت کے ظلم وستم کے زخم ابھی ہرے تھے، خاص طور سے برطانوی اور فرانسیسی سامراج نے اپنے ماتحت ممالک میں ظلم وستم کے وہ پہاڑ توڑے تھے کہ خدا کی پناہ، ماتحت رعایا کے ساتھ جانوروں کا سا سلوک کیا، ان کے اقدار و روایات کی بخیہ دری کی، ان کی تہذیب وثقافت کے پرخچے اڑائے، ان کی روشن تاریخ کے ساتھ کھلواڑ کیا، اس کے مالی ذخائر کے سوتے خشک کردئے اور اسے انتہائی اپاہج اور مفلس ملک بنادیا اور جب سامراجیت کے اس ظالم شکنجہ سے انہیں رہائی ملی تو اس وقت ان کا حال یہ تھا کہ وہ دنیا کے سب سے کمزور، پسماندہ اور مفلس ملک تھے، چنانچہ جمال عبد الناصر کے اس بہادرانہ کارنامہ کو ان ممالک نے قدر کی نگاہوں سے دیکھا، پورے عالم نے چین وسکون کا سانس لیا، ان کی فتح کو اپنی فتح سمجھا، اس لئے کہ جمال عبدالناصر نے مغربی سامراج کو مصر سے ذلیل وخوار واپس کیا تھا، جس سے ان سامراجی ممالک کی بڑی رسوائی ہوئی، اسی ذلت وشکست اور احساسِ ناکامی کا اثر تھا کہ برطانوی وزیر اعظم لارڈ ایڈن نے فوراً اپنا استعفی پیش کردیا تھا۔

مصر کی حفاظت چونکہ سویت یونین کی مرہون منت تھی، اسی کی مداخلت کیوجہ سے مصر امریکی و برطانوی سامراج کے ناپاک عزائم سے بچ رہا تھا، اپنے اسی تعاون کیوجہ سے سویت یونین تمام سامراج مخالف ممالک اور خاص طور سے مصر کا محسن بن گیا اور اسی وقت سے تمام سامراج مخالف ممالک سے اس کے تعلقات خوشگوار ہوگئے اور پھر اس کے نتیجہ میں عالم اسلام نیز عالم عربی میں اشتراکی نظریات کو برگ و بار لانے کا سنہرا موقع ہاتھ آ گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایشیا و افریقہ اشتراکی ملک بن گئے، مصر، شام، عراق، لیبیا، الجزائر، سوڈان، یمن، صومالیہ اور دیگر ممالک میں اشتراکیت کا پورے طور پر تسلط قائم ہوگیا، اشتراکیت کا یہ قبول عام کوئی محمود پیش رفت نہ تھی، بلکہ یہ ایک نئی مصیبت کا پیش خیمہ تھا، وہ سامراج سے کہیں زیادہ خطرناک اور اسلام دشمن تھی، اس لئے کہ اس کی پہلی زد اسلامی اصول وآداب اور دینی بنیادوں پر پڑتی ہے اور اشتراکیت کا ازلی حریف دراصل مذہب ہی ہے۔

عالم عرب میں نمودار ہونے والے موجودہ انقلابات سے ایک نئے خطرہ کا احساس ہوتا ہے، گذشتہ ۵۰ رسالوں میں عالم عرب میں ایسے عوامی انقلابات ظاہر ہوئے، ان میں سے اکثر نے بالآخر اشتراکی انقلاب کی شکل اختیار کرلی، وہ اشتراکی انقلاب جو یورپ کے سرمایہ دارانہ نظام کا دشمن ہے، جس کے نتیجہ میں مغربی یورپ اور مشرقی یورپ میں سرد جنگ چلتی رہی، لیکن ان عرب ممالک میں استبدادی سیاست کا نشانہ اسلامی تحریکات بنیں، لیکن کبھی کسی اشتراکیت مخالف ملک نے اسلامی تحریکات کا ساتھ نہ دیا، اور اسلامی تحریکات پر ظالم حکمرانوں نے غیرانسانی و غیرقانونی پابندیاں عائد کیں، لیکن ان مطلق العنان حکمرانوں کے خلاف کبھی کوئی کاروائی نہیں کی گئی، اسلام پسندوں کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا گیا، سفاکیت و بربریت کا ہر طریقہ ان پر آزمایا گیا، شام میں اخوانیوں کے خلاف حافظ الاسد نے فوجی کاروائی کی اور ان پر فضائی بم باری کرکے ہزاروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا، لیکن اس سب کے باوجود نہ یورپی ممالک کی جانب

سے کوئی صدائے احتجاج بلند ہوئی اور نہ عالمی میڈیا میں مذمت کا کوئی بیان شائع ہوا، مصر، عراق، شام و یمن میں ظلم و بربیت کا یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے، لیکن پورا یورپ نہ صرف یہ کہ خاموش ہے بلکہ اس استبدادی سیاست کے علمبرداروں کو اس کا پورا تعاون حاصل ہے۔

فلسطینیوں پر اسرائیل کے خونچکا مظالم، ان تک سامان رسد پہنچنے کے تمام راستوں پر فوجی پہرہ، غزہ کا اسرائیلی محاصرہ اور اس میں مصر کا تعاون اور صہیونیوں کی ناجائز وغیر انسانی کاروائیوں پر اقوام متحدہ، امریکہ اور اتحادی ممالک کی خاموشی کو آخر کیا معنی پہنائے جاسکتے ہیں؟ پھر آج ۳۰ رسال بلکہ ۵۰ رسال سے ظلم کی چکی میں پس رہے عرب عوام کے ساتھ سامراجی ممالک کی اچانک ہمدردی آخر کیوں؟ اور کہاں گیا وہ ذرائع ابلاغ جب یہ عوام فقر و افلاس کی آگ میں سلگ رہے تھے، پھر آج آخر ایسی ہمدردی و بہی خواہی کس لئے؟ کیا یہ سب ان مظلوم اقوام کے جذبات کا خون کر کے سامراجی ممالک کے مقاصد کی تکمیل کا ایک نیا منصوبہ نہیں؟ اس سوال کا یقینی جواب تو آنے والا نظام اور مستقبل کے حالات ہی دے سکیں گے۔ لیبیا اور دیگر عرب ملکوں میں عوامی انقلاب کی ہمدردی اور حمایت ایک ایسے نئے نظام کی تمہید ہے جو سامراجی مفادات کا محافظ ہوگا، جن ملکوں میں حکمراں تبدیل ہوگئے ہیں وہاں کی رپورٹیں اسی بات کی غماز ہیں اور وہاں اسلام پسندوں کو اقتدار سے الگ رکھنے کی منصوبہ بند کوششیں کی جارہی ہیں۔

امنِ عالم اور عالمی طاقتوں کی کشمکش

اکتوبر ۲۰۰۱ء میں امریکہ نے افغانستان پر جس وقت فوجی حملہ کیا تو کہا جارہا تھا کہ یہ حملہ سپر پاور امریکہ کے زوال کا پیش خیمہ ہے، اس لیے کہ اس سے پہلے برطانیہ نے ایشیا پر اپنے تسلط کے دوران افغانستان پر حملہ کیا تو اسے منھ کی کھانی پڑی تھی اور اپنے مقبوضہ علاقوں سے نکلنے پر مجبور ہونا پڑا، اس کے بعد روس نے افغانستان پر حملہ کیا، جس کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ برطانیہ کے بعد اپنے آپ کو دنیا کے سامنے عالمی طاقت کی حیثیت سے پیش کرے، حالانکہ اس کا اثر ورسوخ اکثر ملکوں پر قائم تھا اور قوموں کے مسائل حل کرنے میں اس کا اہم کردار تھا، چنانچہ اس نے افغانستان پر اپنے غلبہ کو باقی رکھنے کے لیے بھرپور کوشش کی، لیکن کچھ مدت بعد روس کو بھی افغانستان سے ناکام ونامراد نکلنا پڑا اور اپنے مقبوضہ علاقوں سے دست بردار ہونا پڑا، روس کا افغانستان سے اس طرح نکلنا ایک عالمی طاقت کی حیثیت سے اس کا زوال تھا، چنانچہ مقبوضہ علاقے اس کے کنٹرول سے نکل گئے اور سوویت یونین بکھر گئی۔

سوویت یونین کے بکھراؤ کے بعد امریکہ نے پوری دنیا پر کنٹرول حاصل کرلیا اور خود کو ''آقائے عالم'' کی حیثیت سے پیش کیا، اپنے سامراجی مقاصد کی تکمیل کے لیے مختلف قوموں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے، ایک نئے عالمی نظام (ایک قطبی نظام) کو نافذ کرنے کا دعوی کیا جس کو امریکائزیشن کا نام دیا گیا، پوری دنیا کو اپنا تابع بنانے کی کوشش کی اور جس ملک نے بھی اس کی بات ماننے سے انکار کیا، اسے خطرناک انجام کی دھمکی دی، اس کے پندار وتکبر کا نشہ ''نائن الیون نیویارک بلاسٹ'' کے وقت سر چڑھ کر بولنے لگا کہ امریکی صدر

جارج بش نے ببانگ دہل اعلان کر دیا کہ وہ بیک وقت سات ملکوں سے تنہا جنگ کر سکتا ہے، اسے کسی کی ضرورت نہیں، اس کے پاس تمام وسائل اور جنگی ہتھیار کا بھرپور ذخیرہ موجود ہے، چنانچہ اسی نشہ میں اس نے افغانستان پر حملے شروع کر دیے اور ایسے مظالم برپا کیے جس کی گواہی آج بھی وہاں کا ذرہ ذرہ دے رہا ہے، حالانکہ برطانیہ اور روس نے باخبر کیا تھا کہ افغانستان پر حملہ ایک خطرناک غلطی ہوگی، ہم کو اس کا تلخ تجربہ ہے۔

لیکن ضدی امریکی صدر ''جارج بش'' طاقت وقوت کے نشہ میں چور تھا، اس نے کسی کی پرواہ نہیں کی اور اس نے ہر اس شخص کو ڈرایا دھمکایا جس نے اس کی مخالفت کی، یا پھر اس کی ہاں میں ہاں نہیں ملائی، اس وقت سابق عالمی طاقت فرانس، برطانیہ اور روس ٹوٹ چکے تھے، اور جنگوں سے نڈھال تھے، چنانچہ ایسے پرخطر حالات میں افغانستان کے جیالوں نے تنِ تنہا تیسری عالمی طاقت کا اسی طرح مقابلہ کیا جس طرح انہوں نے اس سے پہلے دو عالمی طاقتوں کا مقابلہ کیا تھا۔

ابھی افغانستان کا المیہ ختم بھی نہیں ہونے پایا تھا کہ امریکہ نے عراق پر حملہ کر دیا، وہاں کے نظام کو غارت کر کے رکھ دیا، روس اس وقت مقابلہ کی پوزیشن میں نہیں تھا جو عراق کا حامی تھا، چنانچہ عراق کا نظام درہم برہم ہو گیا، اور خود امریکہ وہاں امن وقانون کی بحالی میں ناکام رہا، لہٰذا آج بھی عراق امریکی حملہ کے باعث پیدا ہونے والی مشکلات کا سامنا کر رہا ہے اور سنگین بحرانوں سے دوچار ہے۔

اس کے بعد ''عرب بہاریہ'' کے دوران امریکہ کی قیادت میں ''ناٹو'' نے روس نواز لیبیا پر حملہ کیا، اس وقت بھی روس کچھ نہیں کر سکا، خاموشی اختیار کر لی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لیبیا کا پورا سیاسی نظام تباہ ہو گیا، روز بروز ملک کی سیاسی حالت خراب سے خراب تر ہوتی گئی اور ملک میں ابھی تک استحکام قائم نہ ہو سکا۔

شام میں بھی انقلاب لانے کی کوشش کی گئی اور امریکہ نے انقلابیوں کی مدد کی، لیکن اب

حالات بدل گئے ہیں، روس نے پوتن کی قیادت میں اپنی طاقت بحال کرلی ہے، اور اپنے کھوئے ہوئے وقار کو دوبارہ حاصل کرلیا ہے، روس کا موقف بدل گیا ہے اور اب روس مقابلہ پر آ گیا ہے، جس کی وجہ سے دوسری طرف امریکہ اپنی گرتی ہوئی اقتصادی حالت کیوجہ سے کمزور اور ''نرم'' پڑ گیا ہے، روس نے شام پر حملہ کرنے کے لیے امریکی قرارداد کی مخالفت ہی نہیں کی؛ بلکہ شام کے موجودہ نظام کو مستحکم کرنے کے لیے تمام ذرائع کا استعمال کیا، چنانچہ روس نے ان تمام کوششوں کو ناکام بنادیا جو شامی بحران کو حل کرنے کے لیے کی جارہی تھیں، حتی کہ امریکہ نے شام کے مسئلہ میں اپنے موقف میں تبدیلی کا اشارہ دے دیا ہے، اسی وجہ سے شام کا بحران مزید سنگین ہوتا جارہا ہے، یہی صورت حال آج مصر کی ہے، جہاں ایک فوجی نظام کو توڑ کر دوسرا فوجی نظام نافذ کیا گیا، جمہوری طریقہ سے منتخبہ حکومت کا تختہ پلٹ دیا گیا، روس نے بھی اس فوجی اقدام کی علانیہ طور پر تائید کی، جس کی وجہ سے مصر میں افراتفری مچی ہوئی ہے۔

یہ صورت حال اس بات کی گواہی دے رہی ہے کہ امریکہ اب کمزور ہوگیا ہے، جس کا اندازہ سیاسی مبصرین نے افغانستان پر حملہ کے وقت ہی کرلیا تھا، اسی وجہ سے امریکہ کے حلیف اپنے تعلقات پر نظر ثانی کررہے ہیں، جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ امریکہ بکھر رہا ہے، جیسا کہ روسی موقف کیوجہ سے امریکہ کو پہلے بھی کوریا کے سلسلہ میں شرمندگی بلکہ ہزیمت اٹھانی پڑی، اس طرح سابق اشتراکی طاقت کے دوبارہ سر اٹھانے اور دنیا کے نظام میں نئے سرے سے مداخلت کرنے کا خطرہ پیدا ہوگیا ہے۔

یقیناً ایک عالمی طاقت کا غلبہ عالمی امن کے لیے خطرہ ہے، اس سے پہلے ایک اشتراکی نظام تھا، دوسرا سرمایہ دارانہ نظام تھا اور تیسری طرف افروایشین بلاک تھا، دنیا ایک طاقت کا غلبہ اور دو طاقتوں کے درمیان ٹکراؤ کا بھیانک انجام دیکھ چکی ہے، موجودہ خطرناک حالت کو صرف وہی طاقت درست کرسکتی ہے، جس کے سامنے عظیم مقاصد اور انسانیت کی اعلیٰ اقدار کی واضح مثالیں ہوں، جو حق و باطل کے درمیان فرق کرتی ہو، اور اچھے برے اور ظالم

ومظلوم کی تمیز رکھتی ہو، رہی بات اقوام متحدہ کی تو اس نے اپنے اس اثر ورسوخ کو کھو دیا جس کے ذریعہ وہ ایسے خطرناک حالات اور موجودہ کشمکش کا حل پیش کر سکتی تھی، موجودہ حالات اس بات کا تقاضہ کر رہے ہیں کہ اس میں نئے سرے سے تبدیلی کی جائے، پرامن وخوشگوار ماحول فراہم کیا جائے، ان تمام ذرائع کا استعمال کیا جائے، جس سے ظالم حکومتیں سر تسلیم خم کرنے پر مجبور ہوں، عدل وانصاف کے تمام شعبوں کو مستحکم کیا جائے، انسانی حقوق کی پاسداری کی لیے انسانی حقوق کی انجمن اور عالمی عدالت قائم کی جائے، اس کے ساتھ ساتھ ہر معاملہ میں مداخلت سے کلی طور پر اجتناب کیا جائے، اور بڑی طاقتوں کی جانب سے ہر قرارداد پر لبیک کہنے سے گریز کیا جائے، اگر اس طرح کے نظام کا نفاذ نہیں ہوگا تو پھر انسانیت پر خطرات کے سیاہ بادل ہمیشہ منڈلاتے ہی رہیں گے۔

پرامن ماحول کی فراہمی، عادلانہ نظام کی بحالی اور انسانی اخلاق واقدار کی پاسداری موجودہ حالات کے بنیادی تقاضے ہیں، جہاں تک امن وسلامتی کا تعلق ہے، وہ تو آج پوری دنیا سے رخصت ہو چکا ہے، خاص طور سے اسلامی ممالک تو بڑی طاقتوں کے مابین کشمکش کا شکار ہیں، جس کی بنا پر ان کے پاس مشکلات کے حل اور پریشانیوں کے سد باب کا کوئی چارۂ کار نہیں ہے، ان کی بے بسی وعاجزی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ وہ معصوم بچوں وبے گناہ عورتوں کے قاتلوں کے خلاف زبان بھی نہیں کھول سکتے ہیں، یہ کسی ایک ملک کی نہیں، بلکہ تمام ملکوں کی یہی صورتِ حال ہے، خواہ وہ مصر ہو، یا شام ہو، یا پھر عراق، آج کے دور میں انسان کی حیثیت اور قدر ومنزلت سب مٹ چکی ہے، اس کا شمار نہایت حقیر شئ میں ہونے لگا ہے، اس کے حقوق پامال کیے جارہے ہیں، اس کی عزت وناموس کے ساتھ کھلواڑ ہو رہا ہے، ایسے بھیانک دور کا نقشہ کھینچتے ہوئے قرآن کریم میں فرمایا گیا "ظهر الفساد في البر والبحر بما كسبت أيدي الناس" [الروم: ۴۱] سمجھ میں نہیں آتا کہ علوم وفنون، تہذیب وتمدن اور سائنس وٹکنالوجی میں اتنی ترقی کے باوجود آج انسانوں کے ساتھ وہی برتاؤ اور

سلوک کیا جارہا ہے جو کبھی جہالت وظلمت کے دور میں کیا جاتا تھا، چنانچہ اسی حقیقت کو واشگاف کرتے ہوئے شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبالؒ گویا ہیں:

یورپ میں بہت روشنی علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
رعنائی تعمیر میں رونق میں صفا میں
گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کے عمارات
ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے
سود ایک کا لاکھوں کے لیے مرگ مفاجات
یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات
بیکاری و عریانی و میخواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات؟
وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم
حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات

شاعرِ مشرق مزید ان الفاظ میں گویا ہیں:

شیوۂ تہذیب نو آدم دری است
بردۂ آدم دری سودا گری است
ایں بنوک ایں فکر چالاکِ یہود
نور حق از سینۂ آدم ربود!
تا تہ و بالا نہ گردد ایں نظام
دانش و تہذیب و دیں سو دائے خام

مغربی سامراج کی واپسی

آج سارا عالم خاص طور سے عالم اسلام خطرناک دور سے گزر رہا ہے، اس خطرہ کے آثار ان عرب ممالک میں نظر آئے جہاں حالیہ برسوں میں عوامی انقلابات برپا ہوئے، لیکن آج حالات پھر ویسے ہی ہوگئے ہیں، جیسے کہ پہلے تھے، اور پیمانے بدل گئے ہیں، ان انقلابات کا مقصد یہ تھا کہ اس ظالمانہ عسکری نظام حکومت سے آزادی حاصل کی جائے جس نے تمام تر آزادیوں کو چھین لیا تھا، خاص طور سے دینی آزادی کو سلب کرلیا تھا، اشتراکی ممالک میں دین اور دیندار حضرات کا مذاق اڑایا جارہا تھا، خصوصاً مصر، شام، تونس، یمن اور لیبیا میں دین اور علماء دین کا استہزاء عام ہوگیا تھا، دینی وسماجی اصلاح کا کام کرنے والوں کو جیلوں میں ڈال دیا گیا تھا، قید خانوں میں ان کو وحشیانہ سزائیں دی جارہی تھیں، اور ان کی ایک بڑی تعداد کاروان شہیداں میں شامل ہوگئی۔ "من المؤمنین رجال صدقوا ما عاهدوا الله علیه فمنهم من قضی نحبه ومنهم من ینتظر وما بدلوا تبدیلاً" (الأحزاب:۲۳)۔(ان ہی ایمان والوں میں وہ لوگ بھی ہیں کہ انہوں نے جو عہد کیا وہ پورا کر دکھایا تو بعضوں نے اپنا ذمہ پورا کر دیا اور بعض انتظار میں ہیں اور ذرا بھی نہیں بدلے)

جمہوریت اور حقوق انسانی کی پاسداری کا دعوی کرنے والے مغربی بلاک نے ظالمانہ فوجی نظام کو تسلیم کرلیا، اس نے نہ تو اس نظام کی کوئی مذمت کی اور نہ ہی اس کے مظالم سے پردہ ہٹانے کے لیے کوئی اقدام کیا، چہ جائے کہ وہ اس نظام کو تبدیل کرنے کی کوئی زحمت گوارہ کرتا، چنانچہ جب ان ممالک میں انقلابات ہوئے اور آزادی کا اعلان کیا گیا اور موجودہ حالات میں اپنا کردار ادا کرنے کے لیے مظلوم اسلامی عنصر سامنے آیا، تو اس

مغربی بلاک میں ہلچل مچ گئی، جس نے سابقہ فوجی نظام کو تسلیم کیا تھا، بلکہ اس کی حمایت کرتے ہوئے الیکشن کے جھوٹے نتائج کو قبول کرلیا، اور ان ممالک کی صورتحال کو ایک نئی روش پر لانے کے لئے وہاں دخل اندازی شروع کردی، اور حالات ایک بار پھر ویسے بنادیے گئے جیسا کہ پہلے تھے، اور جو لوگ ابھی قید وبند سے آزادی حاصل کر پائے تھے وہ پھر دوبارہ پس زنداں ڈال دیے گئے، اور سیکڑوں موت کی گھاٹ اتار دیے گئے، ان کا جرم صرف یہ تھا کہ انہوں نے ظالمانہ نظام کے سقوط کے بعد حالات سے فائدہ اٹھا کر ایک منصفانہ نظام حکومت قائم کرنے کی کوشش کی۔

شام وعراق میں مختلف قسم کے واقعات سامنے آئے، اور شام میں تو قتل وغارت گری اور لہو کی ارزانی کا بازار گرم تھا اور یہ تمام کارروائیاں اور سازشیں ان افراد کو انجام کار تک پہنچانے کے لیے ہو رہی تھیں، جو ملک میں ہونے والی جنگ سے گریز کر رہے تھے، شام تو اشتراکی اور فوجی نظام کی مدد کرنے والے ملک روس کے زیر نگیں تھا، اور روس برابر اس فوجی نظام کی پشت پناہی کر رہا ہے، اور وہ بحران کا حل پیش کرنے والی تمام کوششوں کو ناکام بنا رہا ہے، اس وقت بھی مغربی ممالک نے انسانیت کے قتل کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھائی، صدام کو سولی دیئے جانے کے بعد عراق میں امریکہ کی ماتحتی میں ایک ایسا نظام حکومت وجود میں آیا جو اپنے سامنے سر تسلیم خم نہ کرنے والوں کو بدستور موت کے گھاٹ اتارتا رہا، اور امریکہ کی پشت پناہی میں قائم ہونے والی حکومت عراقی قوم کے ایک خاص طبقہ کو نشانہ بناتی رہی، اور پورے ملک میں آئے دن قتل وغارت گری اور خون خرابہ کے واقعات رونما ہوتے رہے، جن کی زد میں مسلسل یہی خاص طبقہ آتا رہا۔

امریکی تسلط کا تقاضہ یہ تھا کہ ملک میں امن وامان قائم ہوجائے، اور بغیر کسی مذہبی، لسانی، قومی اور علاقائی تفریق کے سب کے ساتھ عدل وانصاف کا معاملہ کیا جائے، لیکن وہ ایسا نظام قائم کرنے میں ناکام رہا، کیونکہ حالات نے ایک نیا رخ اختیار کرلیا، کہ وہ عناصر جو

طویل عرصہ سے کچلے جارہے تھے، انہوں نے حالات سے فائدہ اٹھا کر ایسا محاذ قائم کیا جس نے خلافت اسلامیہ کے قیام کا اعلان کر دیا، چنانچہ اس میں عراق وشام کے جنگجو شامل ہوتے گئے، اور پرتشدد کارروائیاں کر کے لوگوں کو اپنا ہم نوا بننے پر مجبور کیا، میڈیا نے ان کارروائیوں کے بعض ایسے ہولناک اور دل دہلا دینے والے مناظر پیش کیے کہ جس کو دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہوگئے، اور ساری دنیا نے اس پر اپنے ردعمل کا اظہار کیا، علماء نے ایسی کارروائیوں کو اسلامی تعلیمات کے خلاف قرار دیا اور کہا کہ اسلام میں شدت پسندی اور دہشت گردی کی کوئی گنجائش نہیں، چنانچہ امریکا اور اس کے حلیف ممالک نے اسلام کی طرف منسوب اس محاذ کا استحصال شروع کر دیا اور جب اس محاذ نے اپنے آپ کو اسلام کی طرف منسوب کرتے ہوئے اسلامی خلافت کی داغ بیل ڈالنے کا ارادہ ظاہر کیا، تو امریکہ نے فوجی مداخلت کا فیصلہ کر لیا، اور اس خطرہ کو ختم کرنے کے لیے جنگی جہاز روانہ کر دیے، امریکی صدر باراک اوباما نے اپنے ایک بیان میں جس کو رائٹر نے شائع کیا تھا، ''عراقیوں کو ایک ایسی حکومت کی تشکیل پر ابھارا، جو مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھتی ہو، تاکہ وہ انتہا پسندوں کا متحد ہو کر مقابلہ کریں، اور ہر وقت احتیاط سے کام لیں کیونکہ بھیڑیا دروازہ تک پہنچ چکا ہے، اور تن تنہا امریکی فضائی حملے اس کے لیے کافی نہیں''۔

براک اوباما نے وہائٹ ہاؤس میں صحافیوں کے ساتھ پریس کانفرنس کرتے ہوئے یہ عہد لیا کہ وہ عراق میں امریکی فوج کی توسیع کے لیے حتی الامکان کوشش کریں گے تاکہ داعش کے انتہا پسندوں کو روکا جاسکے، اور یہ صرف عراق ہی کے لیے خطرہ کا باعث نہیں بلکہ پورے خطے کے لیے خطرناک ثابت ہو رہے ہیں۔

اس میں برطانیہ بھی امریکہ کا ہم خیال ہو گیا اور اس نے نام نہاد اسلامی انتہا پسندی پر اپنے خدشات کا اظہار کیا، چنانچہ برطانوی وزیر اعظم ''ڈیوڈ کیمرون'' نے اپنے ایک بیان میں امریکی صدر براک اوباما کی تائید کی، اور ستم یہ کہ انہوں نے ان تمام مصائب وآلام سے

تجاہل عارفانہ برتا، جن سے دنیا کے مختلف خطوں میں مسلم اقلیتیں دوچار ہیں۔

بڑے تعجب کی بات ہے کہ امریکہ و برطانیہ دونوں ہی دنیا کے دیگر ممالک خاص طور سے انگولا، برما، فلپائن، تھائی لینڈ اور سری لنکا وغیرہ میں مسلمانوں پر جو ظلم وستم کے پہاڑ توڑے گئے اور توڑے جارہے ہیں، ان دونوں ملکوں نے اس کے خلاف ذرا بھی لب کشائی کی جرات نہیں کی، حالانکہ ذرائع ابلاغ میں اس کی تفصیلات آتی رہتی ہیں۔

یہ بیانات اس بات کی طرف اشارہ کررہے ہیں کہ معدنیات وقدرتی ذخائر سے لبریز عالم اسلام میں امریکی ویورپی دخل اندازی یقینی ہے، اور وہاں ان ممالک کا قبضہ ہوگا جس کی وجہ سے سامراجی نظام پھر قائم ہوجائے گا، اس کا اصل محرک یہ ہے کہ مغربی ممالک کا اقتصادی نظام زوال پذیر ہے، افلاس وغربت کا دور دورہ ہے، اندرونی امن وسکون غارت ہوچکا ہے، اور عام بے روزگاری کا ماحول بن گیا ہے، لہذا اب اس کا سیدھا نشانہ عالم اسلام ہے، اب اگر سامراجی ممالک عالم اسلام پر حملہ کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں، تو اسلامی ممالک سے سامراجیت کا خاتمہ ممکن نہیں ہوگا، بلکہ مداخلت کے جواز پیدا کرکے سامراج دنیا کے دیگر ممالک میں داخل ہوجائے گا، اس مقصد کے لیے خواہ امن وامان کی فضا کو درہم برہم کرنا پڑے، یا پھر قوموں کے درمیا انتشار وخلفشار، ملکوں میں خانہ جنگی کے حالات، یا مختلف دھڑوں میں اختلافات اور ٹکراؤ پیدا کرنا پڑے۔ اس سے دریغ نہیں کریں گے، موجودہ حالات اس کے غماز ہیں۔

سامراج ساتویں صدی کے نصف میں مصر سے شروع ہوا، پھر اس کا دائرہ وسیع ہوتے ہوئے ایشائی ممالک تک پہنچ گیا، مغربی سامراج کے مقصد کو اس وصیت نامہ سے سمجھا جاسکتا ہے جس کو سامراج کی دستاویز کہا جاتا ہے، یہ وصیت نامہ ۱۵/مارچ ۱۶۷۲ء کو جرمن مفکر لیبنز leibniz (۱۶۴۶ء۔۱۷۱۶ء) نے لوئی چاردہم (louisXIV) کو روانہ کیا تھا، اس وقت فرانس طاقتور ملک تھا اور جرمنی سے اس کی کشمکش تھی، جرمن مفکر نے ۱۶۷۲ء میں پیرس

جا کر لوئی چاردہم کو جرمنی کے بجائے مصر پر حملہ کے فوائد سمجھائے۔

''میں آپ کی توجہ ایک پلان کی طرف متوجہ کرانا چاہتا ہوں، یہ مصر پر حملہ اور قبضہ کا پلان ہے، مصر کے علاوہ دنیا میں کوئی ایسی جگہ نہیں ہے جس پر قبضہ کرنے سے پورے عالم پر قبضہ کیا جا سکتا ہو، اور ساری دنیا کی تجارت اپنے قبضہ میں آسکتی ہو، یہ کثیر آبادی اور زرخیز زمین والا ملک ہے، جس کی مثال ملنا مشکل ہے، یہ قدیم زمانہ میں علم وتمدن کا مرکز رہا ہے، اور خدا کی نعمتوں کا حامل، لیکن اب یہ مسلمانوں کے قبضہ میں ہے، جو ہمارے دشمن ہیں، یہ کیوں مسیحیت سے محروم رہے؟ یہ ایشیا اور افریقہ کے درمیان پل کی حیثیت رکھتا ہے، اس کے ذریعہ ہم ایشیا اور افریقہ پر قبضہ کر سکتے ہیں، یہ بحر احمر Red Sea اور بحر ابیض Mediterranean Sea کے درمیان حائل ہے، پورے مشرق تک پہنچنے کا راستہ ہے، آپ کے لیے مصر پر قبضہ آسان ہے۔ قسطنطنیہ پر ترکوں کا قبضہ ہے، لیکن اگر مصر پر ہنگامی حملہ کیا جائے تو خلافت عثمانیہ کے لیے اس کی مدد کرنا مشکل ہے، اس کے علاوہ مصر وسیع ریگستانی علاقوں سے گھرا ہوا ہے''۔

اس کے بعد روس وامریکہ نے مصر وشام اور عراق پر قبضہ کر لیا۔

اگر عالم اسلام خاص طور سے عالم عربی میں مسلمانوں میں آپسی انتشار وافتراق بڑھتا رہا،، اختلافات اور جھگڑے جاری رہے، اور مذہبی، فکری، علمی اور قومی تعصب کی آگ بھڑکتی رہی تو وہ دن دور نہیں جب یہ پورا خطہ مغربی سامراج کے قبضہ میں ہوگا؟!۔

عالم اسلام کی موجودہ صورت حال اور مغرب کا متضاد موقف

گزشتہ صدی کی ساٹھ کی دہائی میں عالم اسلام کے ان ملکوں میں بیداری کے آثار ظاہر ہوئے جنہوں نے مغربی سامراج سے سیاسی طور پر آزادی حاصل کر لی تھی، لیکن ذہنی، فکری اور تہذیبی طور پر مغرب کے تابع اور غلام بنے رہے، ان آزاد ملکوں کی قوموں کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ ان کی سیاسی قیادت زندگی کے مسائل کے حل میں ناکام ہو چکی ہے اور ناکامی کا یہ احساس اس وقت اور زیادہ بڑھ گیا جب مغرب نواز حکمراں علاقائی سلامتی اور قومی وحدت کی حفاظت میں ناکام ہو گئے، اس کے بعد ۱۹۶۷ء کی جنگ میں انقلابی اور فوجی قائدین کی ناکامی نے اس احساس کو یقین میں بدل دیا، جنہوں نے اپنے زمانۂ اقتدار میں صرف اپنے مخالفین کو ختم کرنے اور مغربی افکار خصوصاً اشتراکیت کو عالم اسلام میں نافذ کرنے کی کوشش کی، اسلام پسندوں، داعیوں اور مصلحین کو یا تو جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا یا ان کا صفایا کر دیا، مغرب کی بھرپور تائید کی، معیشت، سیاست اور نظام تعلیم و تربیت میں مغرب کی کورانہ تقلید کی اور مغربی منصوبہ کے تحت مسلم قوموں کی اسلامی شناخت، ان کے دینی تشخص، دین سے محبت و تعلق، دینی حمیت و غیرت اور اسلامی شعائر و مقدسات کی حفاظت کے جذبہ کو ختم کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔

مسلمانوں کی یہ بیداری فطری تھی، مشہور مستشرق ولفریڈ کانٹویل اسمتھ (۱۹۱۶ء-۲۰۰۰ء) Wilfred Cantwell Smith نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے کہ عالم اسلام میں

رائج نظام حکومت کی ناکامی کے احساس کے نتیجہ میں اسلامی بیداری آئی۔ ولفرڈ اسمتھ اپنی کتاب ''اسلام عصر جدید میں'' (Islam in Modern History) میں لکھتا ہے:۔

''عالم عربی واسلامی میں بیداری ۱۹۶۷ء کی ناکامی کے نتیجہ میں پیدا ہوئی، چنانچہ اس ناکامی کے طبعی ردعمل کے طور پر اسلامی جماعتیں اور تحریکات پوری قوت سے میدان عمل میں آگئیں، نوجوانوں نے اس شکست کے اثرات کا مقابلہ کرنے کے لیے دین کا سہارا لیا، اور ان میں اپنے مذہب سے بے پناہ لگاؤ پیدا ہوا، ان نوجوانوں نے عقاد، طہ حسین، احمد امین، ہیکل اور عمر فروخ کے دفاعی موقف کو اختیار نہیں کیا، بلکہ اسلام سے دفاع کو اپنا شعار بنالیا اور یہ اعلان کردیا کہ ان مفکرین کے خیال کے مطابق اسلام مسلمانوں کی پستی کا سبب نہیں ہے، بلکہ اسلام ایک آفاقی، کامل اور لافانی مذہب ہے جو تہذیب وتمدن اور اور انسانی ترقی کا داعی ہے، اسلامی تحریک نے مدافعانہ پوزیشن کو چھوڑ کر اقدامی موقف اختیار کیا، اور اسلامی بنیاد پر ایک ایسا سماج قائم کرنے کی کوشش کی جس میں عدل وانصاف اور انسانیت کا فروغ ہو، اس تحریک کا بنیادی محرک وہ کامیابی تھی جو اس نے سامراجی حملہ کو ناکام بنانے اور سماج کو اخلاقی بے راہ روی اور کرپشن سے پاک کرنے میں حاصل کرلی تھی، اس تحریک کے خیال میں موجودہ معاشرہ موقع پرستی ومفاد پرستی کی بنیادوں پر قائم ہے، اور اس کی باگ ڈور مفسدین کے ہاتھوں میں ہے، اس لیے معاشرہ کی اصلاح کے لیے ایک ایسے جامع پروگرام کی ضرورت ہے، جس میں فکر اسلامی عصر جدید کی مشکلات اور مسائل کا حل پیش کرنے میں فعال اور تعمیری کردار ادا کرے، یہی وہ فکر ہے جس کا مختلف ملکوں میں مغربی افکار ونظریات اور مادی نظام زندگی سے راست ٹکراؤ ہے''۔

بعض مشہور قلمکاروں نے موجودہ عصر کو ''بیسویں صدی کی جاہلیت'' سے تعبیر کیا

ہے، اور دلائل وواقعات کی روشنی میں مغربی تمدن کے دجل ومکر اور افلاس کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مغربی ممالک عالم اسلام کے ذخائر ومعدنیات کا استحصال کررہے ہیں۔

نئی نسل میں یہ احساس وشعور ان کتابوں کے مطالعہ سے اور زیادہ بڑھتا چلا گیا جن کے مصنفین نے مغربی تمدن پر جرأتمندانہ اور پراعتماد انداز میں نقد کیا اور سامراجی عزائم سے پردہ اٹھایا، ان ناقدین اور مفکرین نے مغربی تہذیب کو قریب سے دیکھا، پرکھا، اور عالم اسلام کے مسائل کے سلسلہ میں مغرب کی دوغلی پالیسی کا جرأت مندانہ جائزہ لیا، اسی طرح مغرب میں اسلام اور اسلامی مقدسات کی توہین اور شان رسالت میں گستاخی کے واقعات اور مسلم حکمرانوں کی بے حسی اور غلامانہ ذہنیت نے اس شعور کو قوی سے قوی تر کردیا، یہیں سے اسلام کی طرف واپسی کا رجحان بڑھا، اسلامی شریعت کی روشنی میں مسائل کا حل تلاش کیا جانے لگا، اسلامی فکر کے حاملین نے مغربی فکر پر کھل کر نقد کیا، اس کے کھوکھلے پن کو واضح کیا اور مغرب کی نقالی کے نقصانات بیان کیے، اور قوم کے اندر یہ شعور وآگہی پیدا کردی کہ مغرب کس طرح عالم اسلام کو بیوقوف بنارہا ہے، مصائب اور خطرات میں اس کو بے یارومددگار چھوڑ دیتا ہے، عالم اسلام میں رونما ہونے والے واقعات اور حوادث پر جن کی نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ یورپ ابھی تک قرون وسطی کی صلیبی ذہنیت سے باہر نہیں آسکا ہے، وہ آج بھی یہودیوں کا پرزور حامی ہے، اسلامی ممالک سے تعلقات اور دوستی کے باوجود یہودیوں کے مفادات کو مسلم مفادات پر ترجیح دیتا ہے، لوگ جانتے ہیں کہ یورپ سے یہ تعلقات اور یورپی مفادات کی خدمت وحفاظت یک طرفہ ہے، حالات وواقعات سے باخبر حضرات یہ بھی جانتے ہیں کہ یورپ کو مسلمانوں کی ترقی اور ان کے مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں، بلکہ یورپ کی تو یہی کوشش رہتی ہے کہ عالم اسلام کو مسائل ومشکلات میں الجھائے رکھا جائے، اور اس کی معیشت کی کمر توڑ دی جائے، اس کے لیے عالم اسلام میں معاشی مسائل پیدا کیے جاتے ہیں، اور یورپ کی ایجنسیاں اسلامی ملکوں میں نت نئے مسائل، اقتصادی بحران، فکری ٹکراؤ اور فوجی انقلابات کراتی رہتی

ہیں، تاکہ یہ ممالک ان مسائل کے حل کے لیے یورپ کی طرف ہاتھ پھیلائیں، یورپ کا یہی مشن ہے کہ عالم اسلام کو اس کے حقیقی سرچشموں اور انسانی قیادت سے دور رکھا جائے، اس کے لیے عالم اسلام کی حکومتوں پر پردہ ڈالا جاتا ہے کہ اسلامی بیداری کی ہر تحریک کو کچل دیا جائے۔

اسلامی ملکوں میں مغرب نواز نظام حکومت کی ناکامی کے احساس نے تمام باشندگان وطن میں نئے متبادل کی جستجو کا جذبہ پیدا کر دیا، اور یہ احساس اتنا طاقتور تھا کہ اسے دبایا نہیں جاسکا، خود مغربی مفکرین کو یہ اندازہ ہو گیا کہ مسلمانوں میں یہ احساس بہت تیزی سے بڑھ رہا ہے، اور نقصان یا ذلت و پستی کا احساس انسان کو اس کے اسباب کے ازالہ پر ابھارتا ہے، اگر مغرب کے تابع اور غلام ممالک تعلیم کے میدان میں ترقی، سیاست اور معیشت میں استحکام و قوت اور مضبوط دفاعی نظام حاصل کر لیتے اور صنعت و اعلیٰ تعلیم کے میدان میں ترقی حاصل کر کے ترقی یافتہ ممالک کی صف میں آجاتے اور اپنے مسائل حل کرنے کی صلاحیت حاصل کر کے خود کفیل ہو جاتے تب تو مغرب کی اس تقلید کا جواز ہوتا، لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا، بلکہ پستی و ذلت اور معاشی پسماندگی کا شکار ہو گئے، جن ملکوں نے مغربی تمدن اور مغربی نظام زندگی کو اختیار کیا آج وہی سب سے زیادہ مقروض ہیں، اور ان کی معیشت کا دارمدار غیروں پر ہے، اور تعجب خیز بات تو یہ ہے کہ مغرب پر سب سے زیادہ بھروسہ کرنے والے اور اس کے اشارہ پر چلنے والے اسلامی ملکوں کے ہی مسائل سب سے زیادہ پیچیدہ ہیں، اور یہاں سیاسی استحکام کا فقدان ہے، شہری حقوق کی پامالی کی جارہی ہے اور معیشت کی عمارت گرتی جارہی ہے۔

اس تلخ حقیقت نے عالم اسلام میں نئے نظام کی تلاش و جستجو کا جذبہ اور ایک نیا رجحان پیدا کر دیا، اس صورت حال میں اسلام پسندوں کی ذمہ داری تھی کہ اس احساس کو قوت بہم پہنچاتے، اس کے دائرہ کو وسیع کرتے، اور اس احساس کو عام کرنے کے لیے لوگوں کے دلوں اور ذہنوں میں یہ بٹھاتے کہ مغرب کی نقالی و تقلید سراسر نقصان دہ اور پستی و ادبار کا

موجب ہے، اس میں مثقفین، معلمین، سیاسی قائدین اور قانون داں حضرات کو بھی شریک کیا جاتا، اور مغرب سے برآمد کیے گئے قوانین اور نظامہائے حکومت کی ناکامی اور کمزوری کو اجاگر کیا جاتا، اور یہ باور کرایا جاتا کہ مغربی نظامِ سیاست، معیشت اور تعلیم دیگر قوموں کے مسائل کو حل نہیں کرسکتا، اس لیے کہ یہ ان کے طبعی مزاج وذہن، تاریخ، ماحول اور تہذیبی روایات اور قدروں سے متصادم ہے۔

دوسری طرف اسلام پسندوں کی یہ بھی ذمہ داری تھی کہ تمام مسائل کا اسلامی حل اور مغربی نظام کا صحیح بدل پیش کرتے، اور یہ ثابت کردیتے کہ عالم اسلام کے بیشتر مسائل سامراج کے باقیات اور مغربی فکر کی تقلید کا نتیجہ ہیں، اور یہ عالم اسلام پر تھوپے گئے ہیں، اس لیے یہ یورپی تجربات کی روشنی میں حل نہیں کیے جاسکتے۔

اس شعوری بیداری کی ترجیحات میں یہ تھا کہ اسلامی معاشرہ کی اصلاح وتعمیر کے راستہ سے لوگوں کو فکری اور تہذیبی طور پر بیدار کیا جاتا، اسلامی تعلیم وتربیت کے ادارے اور اسکول قائم کرکے ملت اسلامیہ کی صفوں میں ملی، فکری اور تہذیبی وحدت پیدا کی جاتی، اسلامی نظام حیات کی روشنی میں عام زندگی کے مسائل حل کیے جاتے اور ان مغربی مراکز اور اداروں کے خلاف رائے عامہ تیار کی جاتی جو اسلامی ملکوں کے ذخائر اور وسائل کا استحصال کررہے تھے۔

اس اسلامی بیداری کے نتیجہ میں موجودہ نظامِ حکومت کو بدلنے کے لیے ان ملکوں میں عوامی انقلابات ہوئے جہاں مدت دراز سے مطلق العنان اشتراکی نظام حکومت قائم تھا، اور ظالم ڈکٹیٹروں نے اسلامی بیداری کو کچلنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی، اور سول آزادیاں سلب کرلیں، ان ملکوں میں عوامی انقلابات کے نتیجہ میں آمرانہ نظام کے سقوط کے بعد جب آزادانہ الیکشن ہوا تو الیکشن نے ثابت کردیا کہ یہاں کی اکثریت اسلامی شریعت ہی کو پسند کرتی ہے اور اسی کی روشنی میں اپنے تمام مسائل حل کرنا چاہتی ہے، اس اکثریت کا جمہوری حق تو یہ تھا کہ الیکشن میں بھاری اکثریت سے کامیابی کے بعد اس کو حکومت کا موقع

دیا جاتا، لیکن دشمنان اسلام اس کامیابی سے خوف زدہ ہوگئے اور مغربی طاقتوں اور مذہب بیزار عناصر کی مدد سے منتخب سول حکومت کا تختہ پلٹ دیا گیا جیسا کہ جزائر اور ترکی میں کیا گیا، اور ان ملکوں میں فوجی حکمراں پھر واپس آ گئے، یہی منصوبہ آج مصر میں دوہرایا گیا ہے، جہاں منتخب جمہوری حکومت کو ختم کر دیا گیا، اور فوج کی نگرانی میں عبوری حکومت قائم کر دی گئی ہے، اسلام پسندوں کی اندھا دھند گرفتاریاں جاری ہیں، ان کو جیلوں میں بھرا جا رہا ہے، ان کی تنظیم اور پارٹی پر پابندی لگا دی گئی ہے اور اثاثے منجمد کر دیے گئے ہیں، اور یہ سب عالمی سامراجی طاقتوں کی نگرانی میں ہو رہا ہے، الجزیرہ ویب سائٹ کے انگریزی ایڈیشن نے انکشاف کیا ہے کہ اس بات کے واضح اور صاف دلائل موجود ہیں کہ مصر میں ڈاکٹر مرسی کو اقتدار سے بے دخل کرنے اور فوجی انقلاب کرانے کے لیے امریکہ نے مخالفین کو زبردست فنڈ فراہم کیا ہے، دستاویزات سے معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ نے مصر میں قائم اپنے مختلف اداروں کے توسط سے فوجی انقلاب کی راہ ہموار کرنے کے لئے تقریباً نو سو ملین ڈالر خرچ کیا ہے، اور مرسی مخالفین کو بڑی رقمیں دی ہیں۔ (عربی مجلہ ''المجتمع'' کویت، شمارہ نمبر ۲۰۶۲، ۲۰-۲۶/جولائی، ۲۰۱۳ء)۔

سامراجی منصوبہ کے تحت مصر میں ایک بار پھر سابق نظام سے سخت آمرانہ فوجی نظام حکومت نافذ کر دیا گیا ہے، اور عبوری فوجی حکومت نے مرسی کے مؤیدین کے خلاف ظالمانہ کریک ڈاؤن کیا، جس میں ہزاروں مظاہرین مارے گئے، اس وحشیانہ سلوک اور بربریت پر پورا یورپ اور جمہوریت کے دعویدار ملکوں کے قائدین خاموش رہے، انسانی حقوق کی تنظیمیں بھی متحرک نہیں ہوئیں، اس لیے کہ یہ لوگ اسلام پسند کہلاتے ہیں اور اسلام کو دہشت گردی سے جوڑ دیا گیا ہے، بعض سیاسی قائدین نے انکو دہشت گرد قرار دیا، اور ان کے عمل کو غیر جمہوری اور دہشت گردی قرار دیا ہے، دوسری عبوری فوجی حکومت ان کے ساتھ بہیمانہ اور وحشیانہ معاملہ کر رہی ہے، اور جیلوں میں بند اخوان حامیوں کو سخت ٹارچر کیا جا رہا ہے، مظاہرین

اورفوج کے درمیان خونی ٹکراؤ جاری ہے جس میں سیکڑوں مظاہرین جاں بحق ہورہے ہیں۔

مغربی ممالک کے متضاد موقف کی ایک واضح دلیل یہ ہے کہ ایشیا اور یورپ کے متعدد ملکوں مثلاً ایران، فرانس اور پاکستان میں الیکشن ہوا، اور جن پارٹیوں کو اکثریت حاصل ہوئی ان کو اقتدار منتقل کردیا گیا اور ان کی حکومت قائم ہوگئی، اور پارٹیوں نے اپنی پالیسی نافذ کردی، اس پر کسی کو کوئی اعتراض ہوا اور نہ کوئی ردعمل سامنے آیا،، یہ موجودہ مغربی تہذیب کے اصول کے مطابق بھی ہے، اور کامیاب پارٹی کو اقتدار منتقل کردینا ایک طبعی امر ہے، مصر کے تعلق سے بھی اس بات کا تقاضہ تھا کہ مغرب جمہوریت مخالف موقف کی سخت تنقید کرتا اور کامیاب پارٹی کو اقتدار میں رہنے کا موقع فراہم کراتا، لیکن اسلام پسندوں کے ہاتھوں میں اقتدار چلے جانے کے خوف نے ان کو بے چین کردیا اور سب نے مل کر مصر میں منتخب حکومت کو اقتدار سے بے دخل کرا کر فوجی حکومت قائم کرادی، بلکہ ہر طرح کی امداد کا اعلان کیا۔ روسی صدر پوتن نے ۱۷ اگست ۲۰۱۳ء کو دئے گئے اپنے ایک بیان میں زور دے کر کہا کہ ہم مصر میں فوجی حکومت کو ہر طرح کا تعاون دینے کے لیے تیار ہیں، اور اسلام پسندوں سے نفرت اور عداوت کا کھل کر اظہار کیا، ذرائع کے مطابق روسی صدر پوتن خطہ میں اپنی بالادستی قائم کرنا چاہتے ہیں، اور اس کے لئے مشرق وسطی کے ممالک سے تعلقات مستحکم کرنے کی کوشش کررہے ہیں، دوسری طرف خطہ میں دہشت گردی مخالف جنگ میں طاقتور لیڈر کی حیثیت سے سامنے آنا چاہتے ہیں، اسی لئے پوتن مصر اور شام میں اسلام پسندوں کو دہشت گرد قرار دے رہے ہیں اور شام میں بشارالاسد کی کھل کر حمایت کررہے ہیں۔

غیر جمہوری اور مطلق العنان حکومت کی تائید کرنا غیر جمہوری عمل ہے، لیکن جو لوگ جمہوریت، سول آزادی، فرد کی آزادی، اکثریت کے اقتدار کی تائید اور انتخابی نظام کی وکالت کرتے ہیں ان کا رویہ انتہائی افسوسناک ہے، اور اس سے صاف ظاہر ہے کہ دنیا میں رونما ہونے والے واقعات اور تبدیلیوں کے تعلق سے مغرب دوہری پالیسی اختیار کرتا ہے۔

ایک خطرناک رجحان

دور حاضر میں تحریکیں، تنظیمیں، مذاہب ومسالک اور افکار ونظریات کے حامل افراد اپنے اعوان وانصار کی فراہمی اور مطلوبہ مقاصد کے حصول کے لیے بہت سے وسائل وذرائع اختیار کررہے ہیں، ان وسائل وذرائع میں عام شہرت حاصل کرنے کا سب سے مؤثر ذریعہ پروپیگنڈہ اور اپنے حریفوں پر جارحانہ تنقید وتبصرہ ہے، موجودہ دور میں کسی تحریک کی تائید یا کسی تحریک کی مخالفت میں سب سے زیادہ کارگر یہ دونوں ذریعے سمجھے اور استعمال کیے جارہے ہیں، اسی لیے تحریکیں ان لوگوں کا سہارا لیتی ہیں جو زبان وقلم اور تحریر وتقریر کے ماہر ہوں، کیونکہ زبان وقلم کسی چیز کو عقلاً ثابت کرنے اور کسی بھی عقیدہ، نظریہ اور منہج فکر کو عندالناس مقبول ومحبوب بنانے کے بہت ہی مؤثر ہتھیار ہیں، اور ایسے افراد بڑی آسانی سے ہاتھ لگ جاتے ہیں، کیونکہ کسی تحریک، تنظیم اور سیاسی جماعت کی تائید وحمایت مال وزر بٹورنے اور دولت وثروت کے حصول کا بہترین ذریعہ ہے، لہذا زر پرست اور مادہ پرست افراد تمام معاملات وامور میں اپنی کمائی کا ذریعہ اور راستہ تلاش کرتے ہیں اور دو گروپوں کے درمیان پیدا ہونے والے ٹکراؤ اور کشمکش کے حالات کو غنیمت سمجھتے ہیں اور اپنی خدمات پیش کرکے اپنی صلاحیت ومہارت کے جوہر دکھاتے اور مال بٹورتے ہیں۔

زبان وقلم کی اہمیت دور حاضر میں تلوار سے بھی بڑھ گئی ہے، اس لیے کہ زبان وقلم کے اثرات وہاں تک پہنچتے ہیں جہاں تلوار کا گزر بھی نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا پروپیگنڈہ دور حاضر میں ایک کامیاب اور کارگر پیشہ بن گیا ہے اور ذہن سازی اور رائے عامہ ہموار کرنے کے لیے افکار ونظریات، مذاہب ومسالک اور معاصر نظامہائے زندگی اس پر پورا اعتماد کرتے

ہیں اور اسی میں وہ اپنی تمام تر توانائی صرف کر دیتے ہیں، اس لیے انہیں ضرورت پڑتی ہے ایسے باصلاحیت اور تجربہ کار افراد کی جو ان کے افکار و نظریات کو اعلیٰ پیمانے پر عام کر سکیں اور ان کے خلاف بننے والے ماحول کا رخ موڑ سکیں۔

یہ تحریکیں اور تنظیمیں لوگوں کی توجہات کا مرکز بننے اور اپنے وجود کو ثابت کرنے کے لیے پروپیگنڈہ کے علاوہ دوسرے وسائل بھی اختیار کرتی ہیں جیسے اغوا اور قتل، یہ اغوا اور قتل عملی اور فکری دونوں طرح ہو رہا ہے، جس کا مشاہدہ دنیا کے مختلف حصوں میں کیا جا سکتا ہے، اور انتہا پسند عناصر اپنے مخالفین کو زیر یا ختم کرنے اور اپنے مطالبات کے حصول کے لئے ان دونوں وسائل کا استعمال بکثرت کر رہے ہیں۔

جہاں تک عملی اغوا کا تعلق ہے تو وہ بہت مشہور ہے جس سے ہر کس و ناکس واقف ہے، اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں، فکری اغوا کا مطلب یہ ہے کہ کسی انسان کے خیالات و نظریات کو جسمانی دھمکی یا مالی پیشکش یا معاصر اصطلاح میں "برین واشنگ" کے ذریعہ تبدیل کر دیا جائے، اور اس کا مشاہدہ اس وقت زیادہ ہوتا ہے جبکہ کوئی قائد یا دانشور اپنے پرانے نظریہ اور فکر کو تبدیل کر کے مخالفانہ افکار و نظریات کو اختیار کر لیتا ہے اور ان کا پرجوش ہم نوا و مؤید بن جاتا ہے، اور ان کی تشہیر و تائید میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا ہے، یہ عمل فکری اغوا کہلاتا ہے اور اس کا شکار وہ افراد زیادہ ہوتے ہیں جو مال و دولت یا منصب و عہدہ کے بھوکے ہوتے ہیں۔ اس فکری اغوا کے واقعات جمہوری نظام میں اکثر پیش آتے رہتے ہیں، مختلف پارٹیوں کے ممبران اپنی پارٹی چھوڑ کر شدید نظریاتی اختلافات کے باوجود دوسری پارٹی میں شامل ہو جاتے ہیں اور اپنی پرانی وفاداری بدل دیتے ہیں۔

قتل کی دو شکلیں ہیں۔ (۱) سیاسی۔ (۲) جسمانی

جسمانی قتل یہ ہے کہ انسان کے جسم کو ختم کر دیا جائے اور سیاسی قتل یہ ہے کہ انسان کی شبیہ خراب کر دی جائے اور اس کو اس طور پر پیش کیا جائے کہ اس کی ذاتی کمزوریاں ظاہر

ہو جائیں اور یہ سیاسی قتل متعدد طریقوں سے انجام پاتا ہے، مثلاً اسے کوئی بڑا منصب یا اعلیٰ عہدہ دیدیا جائے یا حکومت میں اسے کوئی وزارت دے دی جائے، یا پارلیمنٹ کا ممبر بنا دیا جائے، یا کسی اہم کمیٹی کا صدر بنا دیا جائے، جمہوری نظام کی موجودہ سیاست میں سیاسی اشخاص میں اس طرح کی تبدیلیوں کا مشاہدہ روزانہ ہوتا رہتا ہے۔

اغوا اور قتل کی ان متعدد شکلوں کا شکار خاص طور پر وہی لوگ ہوتے ہیں جو کسی خاص فکر وعقیدہ کے حامل ہوتے ہیں اور وہ ان پر مضبوطی سے کاربند ہوتے ہیں، اور جو لوگ اپنے افکار ونظریات کی تجارت کرتے ہیں اور ان کے نزدیک افکار ونظریات کی حیثیت محض ایک پیشہ کی ہوتی ہے، وہ کسی خاص فکر کے حامل نہیں ہوتے بلکہ وہ حالات ومصالح کے لحاظ سے اپنے افکار وخیالات بدلتے رہتے ہیں اور حالات کے اعتبار سے دشمن کو دوست بنا لیتے ہیں اور مدافعت کرنے کے بجائے برسرِ پیکار ہو جاتے ہیں، اور اس فکر کے حامل افراد ہر جگہ سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور دلال وایجنٹ بن کر اپنا الّو سیدھا کرتے ہیں، اسی وجہ سے اس زمانے میں دلالوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا ہے اور ان کی کثرت سے علم وثقافت اور تحریری وتقریری صلاحیتیں اس زمانہ میں کسب مال کا اہم ذریعہ بن گئی ہیں۔

مادہ پرستوں، بددینوں اور بدکرداروں میں اس رجحان کا پایا جانا ایک معمولی چیز ہے اور پھر ان سے کسی دوسری چیز کی توقع بھی نہیں کی جاسکتی اور ایسے افراد ہر زمانے میں رہے ہیں اور اس زمانہ میں تو خاص طور سے پائے جاتے ہیں، اس لیے کہ موجودہ سیاست کی بنیاد موقع پرستی ہے جس میں مقاصد ہی کو ترجیح حاصل ہے، بلکہ یہی مقصود ہیں اور وسائل تو ان مقاصد کے خادم ہوتے ہیں، اور ہر وہ وسیلہ جس سے مقصد حاصل ہوتا ہو وہی مفید اور معقول سمجھا جاتا ہے، اور موجودہ سیاست میں یہی طریقہ رائج ہے اور تمام سیاسی پارٹیاں اسی نقش قدم پر چل رہی ہیں۔

حیرت وتعجب کی بات تو یہ ہے کہ اصلاحی تحریکوں، دعوتی تنظیموں اور فکرِ مستقیم سے وابستہ افراد اور دینی رہنمائی کا کام کرنے والے بھی پروپیگنڈہ کا سہارا لینے لگے ہیں،

مسلکی ،نظریاتی اور فکری تعصب کو ہوا دیتے ہیں، نیز سیاسی وفکری اعتبار سے جو لوگ ان کے افکار ونظریات کے سامنے نہیں جھکتے ان کا اغوا کرایا جاتا ہے حتی کہ سیاسی اور جسمانی قتل سے بھی دریغ نہیں کیا جاتا، دوسری تحریکوں اور جماعتوں کے قائدین کو بدنام کرنے اور ان کی شبیہ خراب کرنے سے بھی باز نہیں آتے ، یا وہ خود جھوٹے پروپیگنڈوں کے جال میں پھنس جاتے ہیں اور شہرت اور دولت کی حرص وہوس میں ایسے کام کرنے لگتے ہیں جو خالص مادی ہوتے ہیں، اور اپنے ادنی مقصد کے حصول میں اخلاقیات کو بھی پس پشت ڈال دیتے ہیں، یہ رجحان دعوتی اور اصلاحی کام کرنے والوں کے شایانِ شان نہیں ہے، اس سے کوئی مثبت نتیجہ بھی برآمد نہیں ہوتا اور نہ ہی اس سے کسی دینی واصلاحی عمارت کی بنیاد قائم ہوسکتی ہے، اصلاحی تحریکوں کے رہنما اگر یہ سمجھتے ہیں کہ وہ تنہا ہی اپنے نظریہ اور فکر کو دوسروں پر تھوپ کر مطلوبہ مقاصد حاصل کرلیں گے، تو یہ ان کی خام خیالی ہے، اس طرح کی کوئی بھی سوچ دینی کاز کو نقصان پہنچائے بغیر بارآور ہو ہی نہیں سکتی، اس لیے کہ اس سے بغض وحسد، عناد وعداوت کی چنگاری بھڑک اٹھتی ہے اور فکری ٹکراؤ اور کشمکش کی صورتحال پیدا ہوجاتی ہے، جس کے نتیجے میں تمام قیادتوں سے اعتماد اٹھ جاتا ہے، اور فطری طور پر مسلمانوں کے ذہنوں میں شکوک وشبہات پیدا ہوجاتے ہیں، اور نتیجتاً اسلامی تحریکیں اپنا اثر واعتماد کھو بیٹھتی ہیں۔

دور حاضر میں یہ خطرناک رجحان تمام تحریکوں حتی کہ ان اصلاحی تنظیموں اور تحریکوں میں بھی سرایت ہوگیا ہے، جن کی دعوت تزکیۂ نفس اور معاشرہ کی اصلاح ہے، جن کے پیش نظر صرف یہ ہے کہ لوگوں کو مادیت سے ہٹا کر روحانیت کی طرف لایا جائے، لیکن ان تحریکوں اور تنظیموں کے رہنما خود مادی وسائل جمع کرنے کی دوڑ میں لگے ہوئے ہیں؛ مادی وسائل کا انبار لگا رہے ہیں، کردار کشی اور پروپیگنڈہ کی ذہنیت اپنالی ہے، گروہی عصبیت کو ہوا دے رہے ہیں، دوسری تحریکوں کے قائدین کے ہر اچھے عمل کی نفی، ان پر طعن وتشنیع نیز ان کے تمام کاموں میں بغیر کسی تحقیق ودلیل کے شکوک وشبہات پیدا کرنا ان کی طبیعت ثانیہ بن گئی

ہے، جس کے نتیجے میں ہر عمل متہم اور ہر کوشش ضائع ہو رہی ہے، اسی پر بس نہیں ہے، بلکہ ایک فریق دوسرے فریق کی تمام کوششوں اور کاموں کی تحقیر اور مضحکہ اڑاتا ہے، جس کے نتیجے میں فکری اور نظریاتی ٹکراؤ کا ایک وسیع دروازہ کھل گیا ہے، اور بعض متشدد دین نے تو ہر کام میں معاندانہ رویہ اختیار کرنا اپنا شیوہ بنالیا ہے، اور اب یہ رجحان خطابت و کتابت کی دہلیز پر آپہنچا ہے، خطیب دوسرے کے افکار پر زبانی حملہ کرتے نظر آتے ہیں اور قلمکار اپنی تحریروں سے فریق مخالف کی دھجیاں اڑا رہے ہیں، جس سے امت مسلمہ حیران و پریشان ہے اور عوام کا اپنے قائدین و لیڈران سے اعتماد اٹھ گیا ہے اور لوگ اسلام سے بدگمان ہو رہے ہیں۔

یہ رجحان اسلامی کاز کے مزاج سے میل نہیں کھاتا؛ بلکہ اصلاحی طبیعت کے بھی منافی ہے، اور اس رجحان سے تعمیری کام ہونے کے بجائے تخریبی کام ہو رہا ہے، اس لیے کہ اسلامی عمل کی بنیاد اتحاد، آخرت کے اجر اور رضائے الٰہی کے حصول پر ہے، اور سلف صالح کے نہج پر کام کرنا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَقُلِ اعْمَلُوا فَسَيَرَى اللَّهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُولُهُ وَالْمُؤْمِنُونَ وَسَتُرَدُّونَ إِلَىٰ عَالِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ○

''آپ کہہ دیجئے کہ عمل کیے جاؤ تمہارے عمل کو اللہ اور اس کا رسول اور مؤمنین ابھی دیکھے لیتے ہیں، اور تمہیں ضرور ہی غیب و شہادت کے جاننے والے کے پاس واپس جانا ہے، تو وہ تم کو بتلا دے گا کہ تم اب تک کیا کرتے رہے ہو۔

(سورۃ توبہ: ۱۰۵)۔

اور جہاں تک مادی تحریکوں کا تعلق ہے تو ان کی بنیاد مادی قوت، مادی منفعت، غلبہ اور شہرت کے حصول پر ہے۔

عالم اسلام اور خطرات

عالم اسلام اس وقت مختلف مسائل ومشکلات اور خطرات سے دوچار ہے، کہیں تفرقہ بندی وانتشار، کہیں فکری اور مسلکی اختلافات، کہیں اقتدار کے لیے کشمکش، کہیں افکار ونظریات کی آویزش، کہیں نظریاتی اور سیاسی تنازعات اور مسلح ٹکراؤ، مستزاد یہ کہ ان سیاسی افکار ونظریات کو تھوپنے کے لیے تشدد کا سہارا لیا جارہا ہے، اس صورت حال نے مسلمانوں کو باہم دست وگریباں کردیا ہے، گویا کہ پورا عالم اسلام خون ریزی اور جنگ وجدال کا میدان بن گیا ہے، لیبیا، تونس، عراق، مصر، ترکی، یمن، شام، لبنان، انڈونیشیا، ملیشیا، مالی، صومالیہ، نائجیریا، سوڈان، بنگلہ دیش اور پاکستان کی یہی صورت حال ہے، خوف ودہشت کا یہ عالم ہے کہ بڑی تعداد میں لوگ نقل مکانی پر مجبور ہیں، مختلف سیاسی، نیم سیاسی جماعتیں اور مسلح تنظیمیں اپنے اپنے مفادات کے حصول کے لیے آپس میں برسرپیکار ہیں۔

علاقائی، قومی اور سیاسی تنازعات سے زیادہ سنگین وہ فکری خطرہ ہے جو لٹریچر اور میڈیا کے راستہ سے اسلام کو نشانہ بنارہا ہے، اسلام کی گمراہ کن تعبیر وتشریح کی جارہی ہے، اور یہ اس وقت اسلام اور مسلمانوں کے لیے سب سے بڑا چیلنج ہے۔

مسلمانوں کو اپنی طویل تاریخ میں اس سے قبل بھی دشمنوں سے سابقہ رہا اور ان کو بڑی بڑی مسلح جنگیں لڑنی پڑیں، تین سو (۳۰۰) سال تک مسلمانوں نے صلیبیوں کا مقابلہ کیا، یورش تاتار کا مقابلہ کیا جس نے بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادی، اس کے علاوہ عالم اسلام کے مختلف ملکوں میں لڑائیاں ہوتی رہیں، جن میں مسلمانوں کا کافی جانی ومالی نقصان ہوا۔ لیکن موجودہ وقت میں عالم اسلام کو جس فکری حملہ کا سامنا ہے وہ سابقہ تمام حملوں سے

زیادہ سنگین ہے، اس لئے کہ اب مسلمان نہیں، بلکہ اسلام نشانہ پر ہے۔

قرون وسطیٰ میں استشراق وجود میں آیا، یورپی بیداری کے زمانہ میں یورپ میں علم کو فروغ حاصل ہوا اور مستشرقین کی ایک تعداد نے عالم اسلام کا رخ کیا اور وہاں کے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں درس وتدریس اور بحث وتحقیق کے ذریعہ مستشرقانہ افکار وخیالات (دین میں شکوک وشبہات اور اسلام کی غلط تعبیر وتشریح) کو عام کیا، انہی کی شاگردی اور تربیت میں ایک ایسی جماعت تیار ہوئی جس نے اسلامی تعلیمات اور دینی موضوعات، قرآن، تفسیر، حدیث، تاریخ اور سیرت کو استشراقی نقطۂ نظر سے اپنی بحث وتحقیق کا موضوع بنایا اور اپنے اساتذہ کے گمراہ کن افکار وخیالات کی مسلمانوں میں ترویج واشاعت کی جس کے اثر سے نئی نسلوں کے ذہنوں میں اسلام کے خلاف شکوک وشبہات پیدا ہوگئے۔

مستشرقین کے ان تشکیکی مقالات وتحقیقات اور افکار وخیالات کے اثرات ان لوگوں تک محدود تھے جنہوں نے مغربی زبانوں میں ان کا مطالعہ کیا تھا اور ان کی تعداد بہت تھوڑی تھی، اور جو ان زبانوں سے ناواقف تھے، وہ ان افکار وخیالات کے خطرہ کو نہ سمجھ سکے، لیکن انیسویں صدی کے اواخر میں اہل علم کے ایک طبقہ نے اس خطرہ کو محسوس کیا اور مستشرقین کے افکار وخیالات اور اس طرز پر جو کتابیں لکھی گئیں ان کا علمی جائزہ لینے کا ان کے اندر داعیہ پیدا ہوا اور انہوں نے مختلف موضوعات، سیرت، قرآن وحدیث اور ان کی جمع تدوین کی تاریخ سے متعلق مستشرقین کی علمی اور تحقیقی کتابوں کا عالمانہ ومبصرانہ جائزہ لیا، ان کی چھان بین کی اور ان کے اعتراضات کا علمی انداز میں مدلل جواب دیا اور ان کے خیالات کی تردید کی۔

اسی طرح مسلم قائدین نے مغربی سامراج کا مقابلہ کیا، آزادی کی تحریکیں وجود میں آئیں اور آزادی کے متوالے اور جیالے سامنے آئے جنہوں نے اپنے ملکوں کی آزادی کی خاطر بڑی بڑی قربانیاں دیں جن کی مثال تاریخ میں ملنا مشکل ہے۔ صرف الجزائر کی

جنگ آزادی میں دس لاکھ مسلمان شہید ہوئے، اور عالم اسلام کے دوسرے خطوں میں بھی لاتعداد مسلمان کام آئے۔

اس وقت اسلام کے لیے سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ اسلام کی غلط تعبیر وتشریح اور اس کی صحیح اور صاف ستھری تصویر کو بگاڑ کر پیش کیا جارہا ہے، اسلام کو غلط طریقہ سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی جارہی ہے، اور اب دشمن طاقتیں اسلام کو اسی کے ماننے والوں کے ذریعہ ختم کرنا چاہتی ہیں، اس لیے انہوں نے اب دشمنی کا رخ مسلمانوں کے بجائے اسلام کی طرف پھیر دیا ہے، یہ کام ان نام نہاد مسلمان دانشوروں سے لیا جارہا ہے جن کے افکار وخیالات اسلام مخالف اور طریقۂ سلف سے ہٹ کر ہیں، یہاں تک کہ بعض دانشور جو اپنی اسلام پسندی کا دعوی کرتے ہیں ان کے نظریات بھی اسلام کی اساسیات اور مسلمات سے متصادم ہیں، اور فکر اسلامی کو متقدمین اور علماء دین کی تعبیر وتشریح سے ہٹا کر پیش کررہے ہیں، اور اسلام کے سمجھنے اور سمجھانے میں علماء دین کو چھوڑ کر انہی نام نہاد مسلم دانشوروں کی تشریحات کو اختیار کرنے کی تلقین کی جارہی ہے، ان افکار وخیالات کو مؤثر انداز میں عالم اسلام کی مختلف زبانوں میں لٹریچر کے ذریعہ عوام تک پہنچایا جارہا ہے اور یہ پروپیگنڈہ کیا جارہا ہے کہ اصل دین یہی ہے، اسلاف اور متقدمین اپنے زمانہ میں روح اسلام کو نہیں سمجھ سکے۔

یہی فکری انحراف عالم اسلام کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے جس کی وجہ سے نئی نسل کی سوچ وفکر کو گمراہ اور ان کو دین بیزار کیا جارہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس خطرہ کا مقابلہ کیا جائے اور ایسے افراد تیار کیے جائیں جو اس نئے فتنہ کا سدباب کریں اور نئی نسل کے سامنے دین کی صحیح تعبیر وتشریح پر مبنی صالح لٹریچر پیش کریں، اس لیے کہ یہ ''نیا خطرہ'' لٹریچر ہی کی راہ سے آرہا ہے، تاریخ کے ہر دور میں ایسے خطرات پیش آئے اور مصلحین اور مجددین امت نے زمانہ کے تقاضوں کے مطابق اس کا مقابلہ کیا، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوا لکھا ہے:۔

''ہر دور میں ایسے افراد پیدا ہوئے، جنہوں نے تحریفات اور تاویلات کا پردہ چاک کیا اور حقیقت اسلام اور دین خالص کو اجاگر کیا، بدعات اور عجمی اثرات کے خلاف آواز بلند کی، سنت کی پرزور حمایت کی، عقائد باطلہ کی بے باکانہ تردید اور مشرکانہ اعمال ورسوم کے خلاف علانیہ جہاد کیا، مادیت اور نفس پرستی پر کاری ضرب لگائی تعیشات اور اپنے زمانہ کے ''مترفین'' کی سخت مذمت کی اور جابر سلاطین کے سامنے کلمہ حق بلند کیا، عقلیت پرستی کا طلسم توڑا اور اسلام میں نئی قوت وحرکت اور مسلمانوں میں نیا ایمان اور نئی زندگی پیدا کی۔ یہ افراد دماغی، علمی، اخلاقی اور روحانی اعتبار سے اپنے زمانہ کے ممتاز ترین افراد تھے اور طاقتور اور دلآویز شخصیتوں کے مالک تھے، جاہلیت اور ضلالت کی ہر نئی ظلمت کے لیے ان کے پاس کوئی نہ کوئی ''ید بیضا'' تھا، جس سے انہوں نے تاریکی کا پردہ چاک کر دیا اور حق روشن ہو گیا، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس دین کی حفاظت اور بقا منظور ہے اور دنیا کی رہنمائی کا کام اسی دین اور اسی امت سے لینا ہے، اور جو کام وہ پہلے تازہ نبوت اور انبیاء سے لیتا تھا، اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نائبین اور امت کے مجددین اور مصلحین سے لے گا''۔ (بحوالہ تاریخ دعوت وعزیمت، جلد اول ص: ۲۰)

عالم اسلام کی ابتری کا سبب

دنیا کے دیگر مذاہب ونظریات اور مادی افکار وفلسفات کے مقابلہ میں مذہب اسلام کا امتیازی وصف اس کی جامعیت، وحدت اور عمل وطریقۂ عمل میں تناسب وتوازن ہے، وحدت اسلام کا بنیادی ستون ہے، اور اسلام دین توحید ہے، یہی وجہ ہے کہ توحید کی جلوہ گری زندگی کے ہر میدان میں نظر آتی ہے، خواہ اس کا تعلق عقیدہ سے ہو یا عبادت سے، اخلاق سے ہو یا معاملات سے، اس لیے کہ عقیدۂ توحید ہی وہ بنیادی فیکٹر ہے جو مومن میں احساس ذمہ داری کے جذبات کو جنم دیتا ہے اور پھر اسی شعور واحساس کے نتیجہ میں وہ اپنی ذمہ داری کا پاس ولحاظ اپنے جملہ اقوال وافعال اور حرکات وسکنات میں رکھتا ہے، اس ایمان ویقین کے ساتھ کہ اسے اللہ کے دربار میں حاضر ہونا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ وہ خدا کے احکام وحدود کا امین وپاسبان ہوتا ہے اور ان سے ذرہ برابر بھی پہلوتہی اختیار نہیں کرتا۔

﴿تِلْكَ حُدُودُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوهَا وَمَن يَتَعَدَّ حُدُودَ اللّٰهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ﴾ (بقرہ:۲۲۹)

یہ اللہ کے طے کردہ حدود ہیں تو ان سے تجاوز مت کرنا اور جو اللہ کے حدود سے تجاوز کرتا ہے تو وہی لوگ ناانصاف ہیں۔

وہ ہر ایسے فعل کے ارتکاب سے باز رہتا ہے جو خدا کے احکام سے متصادم ہوتا ہے اور پھر اسی احساس کے غلبہ کی وجہ سے وہ زندگی کے ہر میدان میں صحیح خطوط پر چلتے ہوئے اپنا سفرِ حیات جاری رکھتا ہے، قرآن کریم میں اس کا تذکرہ اس طرح آیا ہے۔

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّن قَوْمٍ عَسَى أَن يَكُونُوا خَيْراً مِّنْهُمْ وَلَا نِسَاء مِّن نِّسَاء عَسَى أَن يَكُنَّ خَيْراً مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوا أَنفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوقُ بَعْدَ الْإِيْمَانِ وَمَن لَّمْ يَتُبْ فَأُوْلَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴾ (حجرات:۱۱)

اے ایمان والو کوئی قوم دوسری قوم کی ہنسی نہ اڑائے، ہوسکتا ہے وہ ان سے بہتر ہوں، اور نہ عورتیں عورتوں کی ہنسی کریں، بہت ممکن ہے وہ ان سے بہتر ہوں، اور ایک دوسرے پر عیب نہ لگاؤ اور نہ برے ناموں سے پکارو، ایمان کے بعد گناہ کا نام ہی برا ہے اور جنہوں نے توبہ نہیں کی تو وہی ناانصاف ہیں۔

اور ایک دوسری جگہ ہے

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِيْنَ لِلّهِ شُهَدَاء بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَى أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى وَاتَّقُوا اللّهَ إِنَّ اللّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴾ (مائدہ:۸)

اے ایمان والو انصاف کے ساتھ گواہی دینے کو اللہ کے لیے کھڑے ہو جایا کرو اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف نہ کرو، انصاف کرتے رہو، یہی تقوی سے قریب تر ہے، اللہ سے ڈرتے رہو، بیشک اللہ تمہارے کاموں سے خوب واقف ہے۔

قرآن کریم نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا؛ بلکہ اس نے اخلاق وآداب کے جزئیات تک کی تعلیم دی کہ آواز کو بلند کرنا، گدھوں کی طرح چیخنا چلانا اور چال ڈھال، کردار وعمل، بول چال، رفتار وگفتار میں غرور وگھمنڈ اور تکبر اللہ کو پسند نہیں، ارشاد باری تعالی ہے۔

﴿ وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحاً إِنَّ اللّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِن صَوْتِكَ إِنَّ أَنكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيرِ ﴾ (لقمان:۱۸-۱۹)

اورلوگوں کے لیے گال نہ پھلاؤ اور نہ زمین میں اکڑ کر چلو، بلاشبہ کسی اکڑنے والے، اترانے والے کو اللہ پسند نہیں کرتا، اور درمیانی چال چلو اور آواز دھیمی رکھو، یقیناً بدترین آواز گدھوں کی آواز ہے۔

اسی طرح اسلام کا ایک نمایاں امتیاز یہ بھی ہے کہ اس نے ہر شعبۂ زندگی میں نرم خوئی ونرم روی، حسن اخلاق اور رحم دلی کی تعلیم دی ہے "ارحموا من في الأرض يرحمكم من في السماء" (تم زمین والوں پر رحم کرو، عرش والا تم پر رحم کرے گا) اور کہیں یہ پیغام دیا "من لا يرحم لا يرحم" (جو دوسروں پر رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا) اور کہیں یہ اعلان کیا "من لا يرحم الناس لا يرحمه الله" (جو لوگوں پر رحم نہیں کرتا اللہ اس پر رحم نہیں کرتا) یہ ہیں وہ کلیدی اور بنیادی اسلامی ہدایات وتعلیمات جن کے نتیجہ میں اسلامی معاشرہ ایک ایسا مثالی معتدل اور متوازن معاشرہ بن کر سامنے آتا ہے جہاں اخوت ومحبت، باہمی تعاون وہمدردی اور غمخواری وخیر خواہی کی بالادستی قائم ہوتی ہے، اپنے وپرائے بلکہ دشمنوں کے ساتھ بھی نرمی اور عفوودرگزر کا معاملہ کیا جاتا ہے، انسان تو انسان ہے جانوروں کے ساتھ بھی نرمی برتی جاتی ہے، بلکہ کیڑے مکوڑوں کے ساتھ بھی رحمت وشفقت کا حکم ہے، اور اس سلسلہ میں واضح تعلیمات موجود ہیں۔

وحدت واجتماعیت، یکجہتی ومساوات، رحم وشفقت اور بغیر کسی ادنی بھید بھاؤ کے تمام انسانوں کے ساتھ ہمدردی اور رحم دلی کے علاوہ اسلام کا ایک امتیازی پہلو یہ بھی ہے کہ وہ عقائد وعبادات سے لے کر اخلاق ومعاملات تک غرض زندگی کے ہر شعبہ میں توازن وتناسب اور ترتیب کو اپنانے کی تعلیم دیتا ہے اور یہ ترتیب اسلام کے عبادتی نظام میں بھی موجود ہے مثلاً نماز اور دیگر ارکان میں، اور اس ترتیب کا تذکرہ قرآن میں نماز، زکوۃ، روزہ اور حج کے تعلق سے جابجا موجود ہے، اسی طریقہ سے تناسب وتوازن میں بھی ترتیب ہے کیونکہ اگر ترتیب کا پہلو سامنے نہیں ہوگا تو وہ عمل بے سود اور بے اثر ثابت ہوگا۔ یہی اسلام کی بنیادی خصوصیت ہے جس میں پہلی چیز وحدت اور دوسری چیز عمل میں ترتیب اور تناسب

وتوازن ہے۔

لیکن آج جب ہم موجودہ حالات پر نظر ڈالتے ہیں اور مسلم ملکوں میں سرگرم اداروں اور تحریکوں وتنظیموں کی ناکامی اور شکست کے اسباب تلاش کرتے ہیں تو اس کا بنیادی سبب یہ نظر آتا ہے کہ ان میں وحدت کا فقدان ہے، عمل وطریقۂ عمل اور سلوک ومعاملات میں ترتیب وتناسب اور توازن کا فقدان ہے، بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ پیمانوں ومعیاروں کا عدم توازن، ترجیحات کا خیال نہ رکھنا، سلوک ومعاملات میں اسلامی تعلیمات کی خلاف ورزی، خدائی احکام وقوانین کی پامالی اور اللہ کے حدود سے تجاوز، یہی وہ بنیادی اسباب ہیں جن کی وجہ سے اسلامی تنظیمیں پوری دنیا میں اور خاص طور سے عرب دنیا میں ناکامیوں سے دوچار ہورہی ہیں۔

اور اس کے برعکس اعمال وسرگرمیوں میں تشدد وقدامت پرستی، قریب وبعید اور دوست ودشمن کے حقوق کا احترام نہ کرنا معاصر زندگی میں غالب نظر آتا ہے۔

اسلام نے قتل ناحق کو ایک شنیع اور ناقابل معافی اور کفر کے مرادف جرم قرار دیا ہے، لیکن اس کے باوجود مسلمان اس کے مرتکب ہورہے ہیں، آج صورتحال یہ ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے خون سے اپنی تشنگی بجھارہا ہے، اور جرم بالائے جرم یہ کہ جو اس کی فکر سے، اس کے نظریہ سے اس کے منہج وطریقۂ کار سے اختلاف کرتا ہے اس کو بھی وہ اپنا باغی، مجرم اور قتل کا مستحق گردانتا ہے، اسلام تو جانوروں کو بھی بے رحمی وبے دردی سے ذبح کرنے سے روکتا ہے۔

لیکن افسوس آج ہمارے معاشرہ میں ایسے افراد پیدا ہوگئے ہیں، جو جانوروں سے بھی بدتر طریقہ پر انسانوں کا خون بہارہے ہیں اور انہیں وحشیانہ سزاؤں سے دوچار کررہے ہیں، بلکہ یہ ظالمانہ واقعات اور معاملہ صرف یہیں تک محدود نہیں؛ بلکہ ان واقعات اور مظالم کو عالمی میڈیا دنیا کے سامنے پیش کررہا ہے جس سے غیر مسلموں کے اندر اسلام اور مسلمانوں

کے تئیں یہ احساس پیدا ہورہا ہے کہ اسلامی کاز کے علمبردار ظالم اور درندے ہیں، اور پھر وہ ان ظالمانہ کاروائیوں کو اسلام کی طرف منسوب کرتے ہیں؛ بلکہ خود قرآن کریم کو ایک ایسی کتاب قرار دیتے ہیں جو تشدد و بربریت کی تعلیم دیتی ہے، حالانکہ قرآن کریم میں بے شمار ایسی آیات موجود ہیں جو شفقت و ہمدردی، رحم و کرم، عفو و درگزر اور صبر و برداشت کی تعلیم دیتی ہیں ﴿وَاصْبِرْ عَلَى مَا أَصَابَكَ إِنَّ ذَلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ﴾ (لقمان:۱۷) [اور تمہیں جو تکلیف پہنچے اس پر صبر کرتے رہو، یقیناً یہ بڑی ہمت کے کام ہیں] ﴿وَاصْبِرْ عَلَى مَا يَقُولُونَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْراً جَمِيلاً﴾ (مزمل:۱۰) [اور ان کی باتوں پر صبر کیجیے اور خوبصورت طریقہ پر ان سے کنارہ کشی اختیار کیجیے]۔

پورے عالم اسلامی کی آج یہی صورتحال ہے، اس صورتحال کے ذمہ دار متشدد اور غلو پسند افراد ہیں، اور اس کی وجہ سے موجودہ نسل سامراجیوں اور دشمنان اسلام کے مظالم کو بھول گئی ہے، لہذا عمل اسلامی کے میدان میں کام کرنے والوں کی ذمہ داری ہے کہ اس طریقۂ کار کو چھوڑ دیں جو مغرب کا دیا ہوا ہے اور وہ ظلم و تشدد اور جبر و اکراہ پر مبنی ہے، اور اس منہج عمل اور طریقۂ کار کو اختیار کریں جو قرآن پیش کرتا ہے۔

﴿وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلاً مِّمَّن دَعَا إِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ صَالِحاً وَقَالَ إِنَّنِي مِنَ الْمُسْلِمِينَ وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا ذُو حَظٍّ عَظِيمٍ وَإِمَّا يَنزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ﴾

(فصلت:۳۴-۳۶)

اور اس سے اچھی بات کس کی ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور اچھے کام کیے اور کہا کہ میں تو فرمانبردار ہوں، اور اچھائی اور برائی دونوں برابر نہیں ہیں، (بری بات کا) جواب ایسا دو جو بہت اچھا ہو تو دیکھو گے کہ جس کے اور

تمہارے درمیان دشمنی تھی اب گویا وہ جگری دوست ہے اور یہ بات اسی کو ملتی ہے جو صبر کرنے والے ہوں اور اسی کو ملتی ہے جو بڑی قسمت والا ہو اور اگر شیطان کی طرف سے تمہیں کچوکا لگے تو اللہ کی پناہ چاہو، یقیناً وہ خوب سنتا اور خوب جانتا ہے۔

نئی صورت حال کے مقابلہ کے لیے

تاریخ اور ملت کی صلاحیت کا جائزہ لینا ضروری ہے

آج امت مسلمہ ایک نازک ترین دور سے گزر رہی ہے، حساس طبیعت لوگ شکست خوردگی اور مایوسی کی کیفیت سے دوچار ہیں، مایوسی کا یہ احساس اور ناامیدی کا ان پر یہ سایہ شاید اس وجہ سے ہے کہ وہ ماضی کے واقعات سے ناواقف اور گذشتہ حوادث سے لاعلم ہیں، البتہ جو لوگ اسلام کی تاریخ، ماضی میں مسلمانوں نے جو تکلیفیں برداشت کیں، ان کے خلاف دشمنوں نے جو سازشیں رچیں، صاحب عزیمت علماء اور مخلص قائدین نے ان سازشوں کو جس طرح بے نقاب اور ان فتنوں کا جس پامردی کے ساتھ مقابلہ کیا اور ان کے شریعت پر عمل پیرا ہونے اور ہر عمل میں رب کی خوشنودی ورضامندی مدنظر رکھنے کی وجہ سے اللہ تعالی نے بے سروسامانی اور وسائل کی کمیابی کے باوجود ان کو فتح وکامرانی سے ہمکنار کیا، اس سے واقفیت رکھتے ہیں، ان کے لیے یہ صورت حال نئی نہیں ہے، ان حالات سے نہ ان کی ہمتیں پست ہوئی ہیں، نہ ان کے عزائم میں کوئی کمی آئی ہے، نہ ان کے ارادے پر کوئی چیز اثرانداز ہوئی ہے، بلکہ یہ واقعات ان کے اندر مزید خوداعتمادی پیدا کرنے، جوش وولولہ بڑھانے، اسلامی تعلیمات پر اعتماد بحال کرنے کے کام کرتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ ان واقعات سے ان کے اس یقین کو اور تقویت حاصل ہوتی ہے۔

جب بھی مسلمانوں نے خطرات اور جنگوں کا صبر وتحمل، حکمت وتدبر، ملی اتحاد واتفاق، ایمان ویقین اور گناہوں سے بچتے ہوئے اور اپنے اعمال کا محاسبہ کرتے ہوئے

مقابلہ کیا، خدا نے ان کی مدد کی اور ان کو فتح حاصل ہوئی، اس طرح کا احساس انہی لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوگا جن کے پیش نظر مسلمانوں کی تاریخ کے فتح وشکست کے دونوں ادوار ہوں، پہلا دور جس میں عہد اول کے مسلمانوں نے شاندار فتوحات حاصل کیں اور بڑی وسیع وعریض اور مستحکم سلطنتیں قائم کیں، جن کی قوت ناقابل تسخیر، جن کی تہذیب قابل تقلید اور جن کا تمدن اس ترقی یافتہ دور میں بھی قابل تقلید نمونہ ہے، دوسرا دور جو آزمائش کا دور ہے، جس میں مسلمانوں نے سخت ترین مراحل کا سامنا کیا اور سخت ترین آزمائشوں سے ان کو گذرنا پڑا اور ایک طویل عرصہ تک ان کو ظلم وستم کا نشانہ بننا پڑا اور آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے اور شاید اس وقت تک جاری رہے گا جب تک تبدیلی کا آغاز خود ہمارے اندر سے نہ ہوگا۔

تاریخ کا مطالعہ کرنے سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنی طویل تاریخ میں مختلف بحرانوں، فوجی اور فکری حملوں، ناکامیوں اور شکستوں سے گزرنا پڑا، لیکن یہ ناکامیاں اور شکستیں وقتی اور محدود پیمانہ پر ہوتی تھیں، اگر انہیں کسی ایک علاقہ میں شکست ہوئی تو دوسرے کسی نئے علاقہ میں غلبہ حاصل ہوا، اگر کوئی ایک علاقہ ان کے قبضہ اور کنٹرول سے نکلا تو دوسرا نیا علاقہ ان کے قبضہ میں آیا، مثال کے طور پر تاتاری حملہ کے بعد بغداد کا سقوط ہوا، تو دوسری طرف سلطنت عثمانیہ قائم ہوئی، مشرق عربی میں مسلمانوں کو شکست ہوئی، تو ٹھیک اسی زمانہ میں برصغیر میں اسلام کا آفتاب طلوع ہوا، اور قسطنطنیہ کی فتح اور اندلس کا سقوط ایک ساتھ عمل میں آیا، اس طرح فتح اور شکست دونوں ساتھ ساتھ چلتے رہے۔

اسی طرح تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ مسلمانوں کو جو بھی کامیابی ملی ہے وہ وقتی کوشش کا نتیجہ نہیں؛ بلکہ جہد مسلسل کا ثمرہ اور طویل تحمل کا صلہ رہی ہے، قسطنطنیہ کی فتح کو لیجیے، دو چار نہیں گیارہ بار مسلمانوں نے اس کا محاصرہ کیا تھا اور پہلے محاصرے میں تو جلیل القدر صحابی حضرت ایوب انصاریؓ بھی شریک تھے، جو ۵۲ھ میں قسطنطنیہ کی فصیل کے سائے میں مدفون ہوئے، آخر کار بار بار کی یہ کوشش رنگ لائی اور صبر

واستقامت نے اپنا کام کر دکھایا کہ ۸۵۷ھ مطابق ۱۴۵۳ء میں محمد الفاتح نے قسطنطنیہ کو فتح کرنے میں کامیابی حاصل کی، ۴۹۴ھ میں بیت المقدس پر عیسائیوں کا قبضہ ہو گیا اور وہاں جس طرح مسلمانوں کا خون بہایا گیا، اس کی تفصیل عیسائی مؤرخوں نے بھی بیان کی ہے، یہ قبضہ نوے سال تک قائم رہا، اس کے بعد عماد الدین زنگی اور نور الدین زنگی نے بیت المقدس کو آزاد کرانے کے لیے اپنی ساری طاقت صرف کر دی، لیکن ان کی کوششوں کا نتیجہ صلاح الدین ایوبی کے زمانہ میں سامنے آیا، چنانچہ صلاح الدین ایوبی نے ۵۸۳ھ میں اس کو فتح کرنے کا کام انجام دیا، ظلم و بربریت کا خاتمہ ہوا اور اسلام کا سورج اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ روشن ہوا، عیسائیوں نے قبضہ کے بعد وہاں ظلم و سفاکی کی جو مثال قائم کی تھی اس کے مقابلے میں صلاح الدین ایوبی نے وہاں عدل و انصاف کا وہ نمونہ پیش کیا کہ عیسائی مؤرخین خاص طور پر لین پول اس کا اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکے، ۶۵۶ھ میں تاتاریوں نے بغداد کو تاراج کیا، عراق کو تباہ و برباد کرنے کے بعد شام کا رخ کیا، لیکن ۶۸۵ھ میں عین جالوت میں ظاہر بیبرس کے ہاتھوں شکست ہوئی، اس کے بعد عراق کو تباہ کرنے والے تاتاری ایک باعمل مسلمان کی دعوت پر حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔

سلطنت عثمانیہ کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بانٹ دیا گیا، ترکوں اور عربوں کے درمیان قومی اور وطنی عصبیت پیدا کی گئی، جس کے نتیجہ میں ترک اور عرب الگ الگ ہو گئے، اور عربی علاقے فرانس اور برطانیہ کے قبضہ میں آ گئے، عالم عربی کو چھوٹے چھوٹے ملکوں میں تقسیم کر دیا گیا، خلافت عثمانیہ کے بعد عالم اسلام منتشر ہو گیا، اور اسلامی وحدت پاش پاش ہو گئی، قومیت عربیہ کے بعد خود عربوں میں وطنی عصبیتیں پیدا کر دی گئیں، اور چھوٹی چھوٹی امارتیں تشکیل دی گئیں، سابق امریکی صدر بش نے کہا تھا کہ اس کا مقصد عالم عربی و اسلامی میں چھوٹی چھوٹی ریاستیں تشکیل دینا اور عالم عربی کے نقشہ کو تبدیل کرنا ہے۔

ترک ایک فوجی اور عسکری قوم تھے، اس لیے انہوں نے اپنی سلطنت کے رقبہ کو

وسیع کرنے کے باوجود تعلیم اور ثقافت پر توجہ نہیں دی، بلکہ مغربی علوم سے استفادہ کیا، اور مغربی ممالک نے خلافت عثمانیہ کے تابع ملکوں میں اسکول اور مشنری تنظیمیں قائم کیں جنہوں نے نئی نسل کے ذہن کو مسموم کر دیا۔

انیسویں صدی کے اواخر میں یورپی سامراجیت کا سلسلہ شروع ہوا، جس میں یورپ (برطانیہ اور فرانس) نے اسلامی امتیازات، اسلامی تہذیب وتمدن کو مٹانے، اسلامی تشخص کو ختم کرنے اور مسلمانوں کی طاقت وقوت کے حقیقی سوتوں کو خشک کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا، برطانیہ اور فرانس میں تعلیم پانے والے مسلم نوجوانوں میں احساس کمتری پیدا کیا گیا، آزادی کے متوالوں کے ساتھ وحشیانہ سلوک کیا گیا، صرف دہلی اور اس کے اطراف میں انگریزوں نے جس طرح ظلم وبربریت کا مظاہرہ کیا وہ تاریخ کا ایک حصہ ہے، لیکن سامراج مسلمانوں کو آزادی کے حصول سے روک نہ سکا، مجاہدین نے آزادی کی خاطر جان ومال کی بے مثال قربانیاں پیش کیں، الجزائر، افغانستان، ایشیائی اور افریقی ممالک کی تاریخ اس کا بین ثبوت ہے، ہندوستان میں پچاس سال تک انگریزوں سے ملک کو آزاد کرانے کے لیے جنگیں لڑی گئیں، جس میں مسلمانوں نے لاکھوں جانوں کا نذرانہ پیش کیا، آخر کار پچاس سالہ کوششوں کا نتیجہ کامیابی کی شکل میں ظاہر ہوا اور یہ ملک غلامی کی زنجیروں سے آزاد ہوا۔ پوری اسلامی تاریخ مسلم مجاہدین کی جان فروشیوں اور قربانیوں سے بھری ہوئی ہے، داغستان میں سید شامل، ترکی میں بدیع الزماں سعید نورسی، الجزئر میں عبدالقادر الجزائری، مغرب اقصی میں امیر عبدالکریم خطابی، لیبیا میں شیخ سنوسی، برصغیر میں سید احمد شہید اور جزیرۃ العرب میں شیخ محمد بن عبدالوہاب کی قربانیاں اور ان کے مجاہدانہ کارناموں نے صلاح الدین ایوبی، اور نورالدین زنگی کی جان فروشیوں کی یاد تازہ کر دی اور یہ اسلامی ممالک غلامی کی زنجیروں سے آزاد ہو گئے۔

سامراجی طاقتوں نے آزاد ملکوں پر اپنا شکنجہ پھر کسنا چاہا، میدان جنگ میں بار بار

شکست کھانے کے بعد انہوں نے مسلم ممالک کو غلام بنانے کے لیے ایک دوسرا راستہ اختیار کیا، اور وہ تعلیم کا راستہ تھا، ایک مغربی مفکر گب کہتا ہے کہ ''ان شکستوں اور بار بار کی ناکامیوں سے بچنے کا راستہ یہ ہے کہ عالم اسلام میں تعلیمی نظام مغربی نظام تعلیم کے طرز پر جاری کیا جائے، نجات کا یہی واحد راستہ ہے، ہم نے مشاہدہ کیا ہے کہ اس ذریعہ سے عالم اسلام کے قائدین اور مذہبی رہنماؤں میں کیا اثر پڑ رہا ہے''۔

چنانچہ انہوں نے اسلامی تہذیب پر حملہ کیا، تعلیمی نظام کو تبدیل کیا، نصاب تعلیم کو اپنے رنگ میں رنگا، اسلامی آثار مٹانے کا کام کیا، تاریخی کتابوں کو از سر نو مرتب کیا، شرعی قوانین پر بے اعتمادی پیدا کرنے اور عربی زبان کو ختم کرنے کی کوشش کی، اسلامی ناموں تک کو تبدیل کر دیا، فرائض تک کی ادائیگی پر پابندی لگا دی اور ان کے ذرائع ابلاغ، نظام حکومت، جاسوسی ادارے، خفیہ تنظیمیں، تفتیشی ٹیمیں سب اسلامی وجود و تشخص کو بدلنے میں پوری طرح مصروف رہیں، لیکن اسلام اپنی سچائی، تعلیمات اور اثر انگیزی کی بدولت پورے یورپ کے لیے ایک چیلنج بنا ہوا ہے، جس کا سامنا یورپ اپنی فوجی برتری، سائنسی ترقی اور مکر پر مبنی سیاست کے باوجود نہیں کر پا رہا ہے، ہزار مخالفتوں اور پابندیوں کے باوجود اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے، مغربی یونیورسٹیوں اور کالجوں سے ایسے اسلامی مفکر اور داعی نکل رہے ہیں جو ایمانی صلابت، دینی غیرت وحمیت اور دین کی خاطر جان قربان کرنے میں ان لوگوں سے کچھ کم نہیں جن کو اسلام وراثت میں ملا اور ان کی نشو ونما کفر والے اور اسلام سے مکمل انحراف والے ماحول میں ہوئی، انہی لوگوں نے اسلام کے جھنڈے کو بلند کیا اور ایسے کتنے افراد ہیں جن کے اندر اسلامی دعوت کا یہ جذبہ یورپ میں رہ کر پیدا ہوا، یہ اسلام کے معجزات میں سے ایک بڑا معجزہ ہے۔

یورپی سامراج نے اپنے دور حکومت میں اسلام سے سخت نبرد آزمائی کی اور اپنے مشنری نظام اور مادی وسائل سے امت مسلمہ کے بہت سے جوانوں کے دلوں میں اثر ڈالا،

حتی کہ ایک سامراجی قائد نے یہ دعوی کیا کہ انہوں نے ایک ایسا نظام تعلیم ترتیب دیا ہے جو مسلمانوں کے اسلامی تشخص وامتیاز کو ختم کردے گا اور ایسی نسل تیار کرے گا جس کی صورت مسلمانوں جیسی ہوگی، لیکن سوچ غیر اسلامی، وہ اپنے مظاہر میں تو آزاد ہوں گے، لیکن فکری اور ذہنی اعتبار سے وہ مغرب کے غلام ہوں گے، لیکن یہ اسلامی دعوت کی کرشمہ سازی تھی کہ معاملہ اس کے برعکس ہوا اور موجودہ نسل بظاہر تو مغرب زدہ نظر آئی لیکن اس کا دل اسلام کی محبت سے لبریز اور اس کا دماغ اسلامی افکار ونظریات سے آباد رہا، یورپ جانے والا دیکھ سکتا ہے، ایسے علاقوں میں جہاں پہلے ایک مسجد نہیں تھی کثرت سے مساجد، اسلامک سنٹر، اسلامی لائبریری وجود میں آرہی ہیں، اسی طرح اخبار ومجلات سے معلوم ہورہا ہے کہ علمی حلقوں میں اسلام کی مقبولیت بڑھ رہی ہے اور اسلام مخالف عناصر بھی اسلام کو گلے لگا رہے ہیں۔

مغرب کی سازشوں اور کاروائیوں کے باوجود الحمد للہ اسلام پھیل رہا ہے، اور مسلمانوں میں جذبہ قربانی اور دین سے وابستگی اور یورپ سے واقفیت بڑھ رہی ہے اس کی مثال خود ویٹی کن کی یہ رپورٹ ہے جو کویت کے عربی مجلہ المجتمع نے اپریل ۲۰۱۴ء میں شائع کی ہے ویٹی کن کی اس رپورٹ کے مطابق پوری دنیا میں سب سے زیادہ پھیلنے والا مذہب اسلام ہے، اسلام مخالف مہم کے باوجود ایک سال میں مسلمان کی تعداد عیسائیوں کے مقابلہ میں تین ملین بڑھی ہے، ویٹی کن کے بیان کے مطابق دنیا میں مسلمانوں کی تعداد ایک ارب، تین ملین، بائیس ہزار سے زیادہ ہے جو عیسائیوں کے مقابلہ میں تین ملین زیادہ ہے، اس وقت دنیا میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب انیس فیصد ہے جبکہ عیسائیوں کی آبادی کا تناسب سترہ فیصد ہے، اسلام قبول کرنے والوں میں زیادہ تر مغرب کے عیسائی، یہودی اور دیگر مذاہب کے ماننے والے ہیں۔

کسی دشمن کا اسلامی ملک پر قبضہ کرنا یا میدان جنگ میں مسلمانوں کا شکست کھانا ایک وقتی معاملہ ہوتا ہے، اسلامی تاریخ میں ایسے متعدد واقعات ہیں، لیکن دل ودماغ،

احساسات وجذبات یہی وہ چیزیں ہیں جو حالات کے رخ کو بدل دیتی ہیں، یورپ نے اس حقیقت کو سامراجی عہد میں سمجھ لیا تھا، اس نے اپنی پالیسی کو عسکری فتوحات کے مقابلے میں ثقافتی وفکری فتوحات کی طرف موڑ دیا تھا، جس میں ان کو ایک حد تک کامیابی بھی ملی، یورپ سامراجی عہد کے بعد سے اسی پالیسی پر عامل تھا، لیکن اخیر دور کے واقعات پھر اس بات پر دلالت کر رہے ہیں کہ یورپ دوبارہ کھلی سامراجیت کی پالیسی کو اختیار کر رہا ہے، یہ فکر اور خیال اس ناکامی کا نتیجہ ہے جو یورپ کو عالم اسلام کے مزاج کو بدلنے میں ہوئی، اس کے واضح اشارات موجودہ مغربی سامراج کی کاروائیوں سے مل رہے ہیں، جس کا مظاہرہ افغانستان، عراق میں اور مالی میں ہوا، اور مصر، شام، لیبیا، تونس، یمن، شمالی افریقہ اور سوڈان میں سامراجی منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کی کاروائیاں جاری ہیں۔

مسلمانوں کی موجودہ صورت حال ماضی کے حالات سے مختلف ہے، ماضی میں انکی آزمائش محدود اور علاقائی تھی، اور آج ان کی آزمائش عالمی ہے جو مصر سے بنگلادیش تک پھیلی ہوئی ہے، اور اس کی شکل بھی مختلف ہے، آج ان کی آزمایش خود اپنوں کے ہاتھوں ہے، جو ان کے اسلامی بھائی ہیں، لیکن عقیدہ اور ثقافت میں ان کے دشمن ہیں، آج مسلمانوں کو باہری حملوں کا سامنا نہیں، بلکہ ان کو داخلی سطح پر حملوں کا سامنا ہے، حکومت، سیکورٹی نظام، عدالتوں، قید خانوں، اسکول اور کالجوں، بلکہ زندگی کے تمام شعبوں پر ایسے افراد قابض ہیں جن کے ذہن ودماغ اور احساس وشعور میں اسلام دشمنی بھری ہوئی ہے، اور وہ مغربی سامراج کے اشارہ پر کام کر رہے ہیں۔

انتہا پسندی اور دہشت گردی یہ دونوں بیرونی اصطلاحیں ہیں، جو سامراجیوں نے اپنے شاگردوں کو سکھلائی ہیں، اسی وجہ سے دانشور اور سیاستداں انتہا پسندی، دہشت گردی اور آزادی کی تشریح سے عاجز ہیں، کیونکہ انہوں نے بغیر سمجھے ان کو قبول کر لیا ہے اور بغیر کسی جواز کے دیندار مسلمانوں اور مسلم داعیوں پر منطبق کر رہے ہیں، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ

اسلامی بیداری کو کچلنے کے لیے جو اقدامات کیے جارہے ہیں وہی سراسر انتہاپسندی اور دہشت گردی ہیں، اور بعض اسلام پسندوں کے اندر جو طیش اور غصہ ہے وہ اس دہشت گردی کا فطری ردعمل ہے جو اسلامی دعوت اور دینی جذبات کے حامل افراد کے خلاف کی جارہی ہے، حتیٰ کہ مغربی تمدن پر نقد اور اس کی خامیوں پر لب کشائی کو بھی دہشت گردی کہا جارہا ہے، یہ دونوں اصطلاحیں میڈیا کے ذریعہ پوری دنیا میں پھیل گئی ہیں۔

یہ ایک نیا خطرہ ہے جس کا بغیر کسی اشتعال انگیزی کے پوری حکمت وبصیرت کے ساتھ مقابلہ کرنا مسلم دانشوروں کی ذمہ داری ہے اور مسلمان داعیوں اور عاملوں کی معنویت کو بڑھانا ہوگا اور موجودہ حالات میں بڑی دور اندیشی اور سوجھ بوجھ سے مسائل کو حل کرنے کے لیے بہتر سے بہتر طریقہ اختیار کرنا ہوگا اور اسلام کو حکمت ودانائی کے ساتھ پیش کرکے جدید مسائل کو آپسی تعاون، باہمی اتحاد، اتفاق اور غور خوض کے ساتھ حل کرنا ہوگا، اسی طرح مسلمانوں کی اسلامی شناخت اور دینی تشخص کی حفاظت کے لیے تعلیم وتربیت کے وسائل پر بھی توجہ دینی ہوگی، اور یہ دونوں ذریعے جب تک مخلص مسلمانوں کے کنٹرول میں نہیں آئیں گے اس تک عالم اسلام کی صورت حال بدل نہیں سکتی، اسی وجہ سے مغرب چاہتا ہے کہ تعلیم وتربیت کا نظام ایسے لوگوں کے ہاتھ میں رہے جو اس کے وفادار اور اس کے مفادات کی حفاظت کرنے والے ہوں، اس صورت حال کو بدلنے کے لیے قابل افراد تیار کرنے اور داخلی اور عوامی سطح پر تبدیلی لانے کی ضرورت ہے، مسلم ملکوں کے اہل دانش وسیاست کو اس خطرہ کو سمجھنا چاہئے اور اس کے لیے اپنی جغرافیائی حد بندیوں سے آزاد ہوکر صرف ملی حدود میں رہ کر فکر کرنی ہوگی، ورنہ ان کی آزادی خطرہ میں پڑ جائے گی۔

شک وشبہ سے اعتماد کی طرف

سارے عالم میں مسلمان کشمکش اور محاذ آرائی جیسے ناگفتہ بہ حالات میں زندگی گذار رہے ہیں۔ مغربی سامراج نے دنیا کے مختلف علاقوں میں مسلمانوں کے لیے ایسے مسائل پیدا کیے ہیں جو مسلمانوں کو اپنے تشخص، آزادی اور عزت نفس کے برقرار رکھنے کے لیے جدوجہد کرنے پر آمادہ کررہے ہیں، ان کی یہ جدوجہد دوسری مظلوم قوموں کی جدوجہد سے مختلف نہیں ہے جو دنیا کے مختلف حصوں میں جاری ہے، لیکن مسلمانوں کی جدوجہد کو طاقت کے زور سے کچلنے کی کوشش کی جاتی ہے، اور اس کو علاحدگی پسندی، تعصب اور دہشت گردی کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ ذہن بھی خود مغربی سامراج کا بنایا ہوا ہے، جس نے اسلام کو ایک خطرہ کی شکل میں پیش کیا ہے اور اسکے سارے وسائل نشر واشاعت اس کا ہر دم چرچہ کرتے رہتے ہیں۔ یورپ کی حکومتیں دوسری حکومتوں کو اس خطرہ کے مقابلہ کے لئے بھڑکاتی رہتی ہیں۔ اس کا یہ خیال ہے کہ اگر مسلم معاشرہ یا مسلم امت یکجا و متحد ہوگئی، یا اس نے فکری وتمدنی میدانوں میں اثر ورسوخ حاصل کرلیا تو ایک ایسا انسانی دھارا وجود میں آجائے گا جو یورپ کے سیاسی، اقتصادی اور اخلاقی تصور سے صرف مختلف ہی نہیں ہوگا؛ بلکہ متصادم ہوگا، کیونکہ مسلمانوں کی حیثیت ایک عالمی طاقت کی ہے جو رنگ ونسل، فرقہ اور معاشی اونچ نیچ کے حدود کے پابند نہیں، وہ سارے انسانوں کو آدم کی اولاد اور سب کو ایک خاندان سمجھتے ہیں، ان کے یہاں برتری صرف اعمال کی برتری ہے، وہ مغرب کے مادی اور غیر اخلاقی فلسفوں سے اتفاق نہیں کرتے، وہ انسان کی غلامی کو، انسان کی بے عزتی تصور کرتے ہیں۔

مسلمانوں میں خودداری وخوداعتمادی، شجاعت وجوانمردی، یقین واعتماد، عزیمت واستقامت، ایثار وخودشکنی، اولوالعزمی وبلند حوصلگی کی ایسی نادر صفات پائی جاتی ہیں جن

سے دوسری قومیں عاری ہیں۔ دوسروں کے مقابلہ میں مسلمانوں میں دوسرے رنگ میں رنگ جانے اور دوسرے قالب میں ڈھل جانے کی صلاحیت بہت کم ہے۔ اسی طرح نقالی اور جبین سائی، ظالم وجابر طاقت، فراعنۂ وقت، حالات ومصائب اور حوادث کے سامنے سر جھکا دینا اور قضا وقدر کا عذر پیش کرنا مسلمانوں کا کام نہیں، مسلمان اپنی عزت وآبرو اور مجد وشرافت کی راہ میں ہر قسم کی مادی ومعنوی قربانی دینے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔

مسلمان بندۂ مال وزر نہیں ہیں، بلکہ ایمان کی قوت اور یقین کی ناقابل تسخیر طاقت انھیں دنیا کے سارے انسانوں سے ممتاز کر دیتی ہے، ان کو دنیاوی زندگی سے محبت نہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ موت سے گھبراتے نہیں ہیں، بلکہ جس کا جتنا زیادہ ایمان قوی ہوتا ہے وہ اتنا ہی راہ حق میں جام شہادت کا حریص ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ موت کی طلب وچاہت مومنوں کی علامت ہے اور حبِّ زندگی غیر اسلامی عناصر کی نشانی ہے، ان کی تاریخ جان نثاری وفداکاری، ایثار وقربانی، سرفروشی وجہاد فی سبیل اللہ کے محیر العقول نمونے پیش کرتی ہے۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں فداکاری وجاں نثاری کے یہ نادر نمونے لوگوں کے سامنے آتے رہے ہیں اور آج بھی مسلمانوں کے دلوں میں قربانی وسرفروشی کا جذبہ موجزن ہے۔

یہ پرجوش جذبہ ایمان ویقین، عقیدۂ آخرت، دلوں میں دنیاوی زندگی کی حقارت ونفرت، نصرت الٰہی اور اخروی کامیابی وکامرانی پر یقین کا ثمرہ ہے۔ خوف ورجا اور ایمان ویقین کا یہی جذبہ مسلمانوں کو دوسری قوموں کے مقابلہ میں جلد متحرک کر دیتا ہے۔ اور ان میں جہد وعمل اور مہم جوئی اور باطل وطاغوتی طاقتوں سے پنجہ آزمائی کی روح پھونک دیتا ہے۔ اسی لیے مادہ پرستوں اور طاغوتی وابلیسی نظامہائے حیات کے علمبرداروں کی سب سے بڑی کوشش یہی رہتی ہے کہ مسلمانوں کی نئی نسلوں کے سینوں میں ایمان ویقین کی جو چنگاریاں دبی پڑی ہیں انھیں جس طرح بھی ہو سکے بجھا دیا جائے اور عرب وعجم ہر جگہ ان کی جرأت دینی اور جذبۂ اسلامی کو فنا کر دیا جائے؛ کیوں کہ یہی وہ جذبہ ہے جو ایک مسلمان

کو ہر قسم کی قربانی کے لئے آمادہ کرتا ہے، بڑے سے بڑے مصائب میں بھی اس کے پائے استقامت میں لغزش نہیں ہوتی، بلکہ نہایت خندہ پیشانی و پامردی سے اس کا مقابلہ کرتا ہے، ان کے دین کی تعلیمات واضح اور روشن ہیں اور ان کا ان تعلیمات پر یقین غیر متزلزل ہے اور اس کے لیے ان کے ادنیٰ شخص کی نگاہ میں ہر قربانی آسان ہے۔

اسلامی شریعت نے حلال وحرام بالکل واضح کر دیا ہے، وہ مسلمانوں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم دیتی ہے اور اسی کو ان کا امتیازی نشان قرار دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دینی شعور رکھنے والا بیدار مغز مسلمان برائی کو برائی کہنے میں تردد نہیں کرتا، اور اچھائی جہاں بھی ہو اس کو اچھائی کہنے میں تکلف نہیں کرتا۔ بلکہ وہ اس لیے پیدا کیا گیا ہے کہ بہتے دھارے کا رخ پھیر دے، امر و نہی ہمیشہ سے شریفانہ زندگی کا رکن رکین رہا ہے، جب کبھی بھی کسی قوم میں اس عنصر نے دم توڑا تو اس میں فساد و بگاڑ، جنسی و اخلاقی بے راہ روی اور جہالت وضلالت کی وبا عام ہوگئی۔ مسلمانوں کی یہ خاص فطرت ہے کہ یہ ایسی تحریک و تنظیم یا ایسی شخصی قیادت سے قربت و تعلق رکھتے ہیں جو ان کی خاکستر میں ایمان ویقین، جرأت دینی، جذبۂ اسلامی کی دبی ہوئی چنگاریوں کو فروزاں کر دے۔ یہی جذبات مسلمانوں کو دوسری قوموں سے ممتاز کر دیتے ہیں۔ مسلمانوں نے ہمیشہ جرأت دینی و ثابت قدمی کے ساتھ ان افکار و نظریات کا جو ان کے دینی مزاج و فکر سے ہم آہنگ نہ تھے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور آج بھی وقتاً فوقتاً وسائل و طریقہ کار کے تناسب سے وہ جرأت دینی و غیرت ایمانی کا مظاہرہ کرتے ہیں جن کے روح پرور نتائج سامنے آتے رہتے ہیں۔

مسلمانوں کو ان جذبات کے برتنے میں صحیح اور حکیمانہ رہنمائی کی ضرورت ہے؛ تاکہ انتہا پسندی کا راستہ اختیار نہ کر بیٹھیں اور صراط مستقیم کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے اور اسلامی حدود سے متجاوز نہ ہوں؛ بلکہ اسلامی تعلیمات اور اس کے طریقۂ کار پر مضبوطی سے کاربند رہیں۔ اور ان تعلیمات کے مظاہرے میں اسلام کی اعلیٰ قدروں اور مثالی طور طریقوں

پر قائم رہیں، کیونکہ مطلوبہ نتائج اسی وقت حاصل ہو سکتے ہیں جب کہ اسلامی تعلیمات پر سختی سے عمل کیا جائے، اس لیے کہ اسلام نے زندگی کے ہر میدان میں کچھ نہ کچھ اصول مقرر کیے ہیں جن کی پابندی ضروری ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو آزادانہ تصرف کا اختیار نہیں دیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض اوقات کچھ سیاست پسند عناصر مسلمانوں کے ان قیمتی جذبات کا استحصال کرتے ہیں اور اپنے سیاسی مفاد کی خاطر مسلمانوں کی صلاحیتوں اور طاقتوں کا استعمال ایسے طریقے پر کیا کرتے ہیں جو اسلامی طریقۂ کار کے سراسر مخالف ہوتا ہے۔ اگر ان وسائل کا استعمال حالات اور ماحول کے جائزہ کے بعد حکمت و دانائی سے کیا جائے تو مسلمانوں کے موقف میں تصادم واقع نہ ہو اور ان مسائل و بحران سے دوچار نہ ہوں جن سے وہ بعض حالات میں دوچار ہوئے ہیں۔ اگر مسلمان اپنے مخاطب کو یہ باور کرادیں کہ ہم حق وصداقت کے پیامبر اور علمبردار ہیں، ہم نہ تو سرزمین میں فساد و بگاڑ چاہتے ہیں اور نہ ہی حکومت واقتدار کے بھوکے ہیں، بلکہ ہم مسلمانوں کی روز اول سے یہ کوشش رہی ہے کہ اس کائنات ارضی میں ہمیشہ عدل وانصاف اور حق وصداقت کا بول بالا ہو۔ حالات پرسکون و پرامن رہیں، امن وسلامتی اور صلح وآشتی کا ماحول بنا رہے، انسانی برادری میں اخوت، بھائی چارگی، مساوات، مہر ومحبت اور اتحاد واتفاق کو فروغ ہو اور بغض وعداوت، ظلم وجور اور عصبیت کا چراغ گل ہو جائے، رنگ ونسل، وطن وقوم کے انسانیت سوز امتیازات کا خاتمہ ہو جائے، ہمارا مقصد صالح انسانی معاشرہ کی تعمیر ہے نہ کہ انسانیت کو قتل کرنا، اگر مسلمانوں نے اپنی انسانی خدمات اور کاوشوں کی صداقت وسچائی اور اپنی بے لوثی و بے غرضی کو ثابت کیا ہوتا تو مسلمانوں اور ان کے مخاطب قوموں کے درمیان جو کشمکش جاری ہے یہ صورت نہ ہوتی، شکوک وشبہات کا بازار گرم نہ ہوتا، بلکہ ان کو اکرام واحترام اور قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا، ملک کی تعمیر وترقی میں ان سے تعاون لیا جاتا، اور انھیں اصلاحی کوششوں اور ترقیاتی پروگراموں اور انسانی خدمات میں شریک کیا جاتا۔

اسی طرح مسلمانوں کے ساتھ جو قومیں رہتی ہیں ان کو بھی چاہیے کہ مسلمانوں

کے تئیں اپنے انکار وہٹ دھرمی اور شک وشبہ کے رویہ کو ترک کر کے انھیں اپنے افکار وخیالات اور احساسات وجذبات ظاہر کرنے کا موقع دیں، کیونکہ رائے اور طریقۂ کار کا مختلف ہونا کوئی نئی بات نہیں؛ بلکہ یہ ایک فطری امر ہے جو زندگی کے ہر میدان میں پایا جاتا ہے۔ جب کہ اس اختلاف رائے سے چھوٹے چھوٹے خاندان اور گھرانے تک محفوظ نہیں ہیں تو یہ ممکن ہی نہیں کہ اس عالمی انسانی برادری میں اختلاف آراء نہ ہو، جس میں انسانوں کے مختلف طبقات رہتے ہیں جن کی صلاحیتیں الگ الگ ہیں، افکار وخیالات جدا جدا ہیں، رہنے سہنے کے ڈھنگ الگ اور عبادت کرنے کے طریقے مختلف، یہ اختلافات ماضی میں بھی تھے جن کو کبھی تو طاقت کے بل بوتے پر قابو میں رکھا گیا، اور کبھی ظالمانہ قوانین نافذ کر کے اور مستبدانہ اقدامات کے ذریعہ، لیکن یہ موجودہ زمانہ آزادی رائے کا زمانہ ہے اور ہر ایک کو اپنی بات کہنے کا حق ہے۔ لہٰذا مسلمان چونکہ ایک عالمگیر دین کے ماننے والے ہیں اور تمدنی وثقافتی ورثہ کے مالک ہیں، انھیں بھی زندگی کے معاملات میں اپنی رائے ظاہر کرنے کا حق ملنا چاہئے اور موجودہ تہذیب کی رو سے جو آزادی رائے کی دعویدار ہے مسلمانوں کی رائے کا احترام کیا جانا چاہئے، خصوصاً جمہوری نظام میں جن میں ہر فرد کو ایک مقام حاصل ہے اور غیر مسلم اکثریت کو اس رائے سے مدد لینی چاہئے۔ اگر ان کی رائے کے موافق ہو، ورنہ اگر موافق نہ ہو تو مہذب اور باعزت طریقہ سے اس رائے کا انکار کر دے۔

لیکن آزادی رائے کو سلب کرنا اور الزام تراشی اور شک وشبہ کی فضا قائم کرنا، یہ موجودہ تمدن کی روح کے خلاف ہے، تمدن اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کسی کو اپنی رائے کے اظہار سے روکے اور اکثریت پر اقلیت کو یا اقلیت پر اکثریت کو مسلط کیا جائے، یہ قومی اور وطنی تصور کے بھی خلاف ہے۔ مسلم رہنماؤں کے لئے البتہ یہ ضروری ہے کہ اپنے افکار وخیالات کا اظہار حکیمانہ اسلوب میں کریں اور اسکے لئے تمدنی روش اختیار کریں تا کہ دوسروں کے دلوں میں بغض وعداوت جیسے مہلک جراثیم جنم نہ لینے پائیں، اگر ان کے

بارے میں شکوک وشبہات پیدا ہوں تو حلم وبردباری سے ان کو دور کریں، جب دونوں فریقوں کے درمیان عجلت پسندی، ظالمانہ کارروائیوں اور جنگی محاذ آرائی کے بجائے باہمی احترام واکرام ایک دوسرے کے احساسات وجذبات کی رعایت، ہم آہنگی ویکجہتی کا معاملہ ہوگا تو کبھی بھی دونوں فریقوں کے مابین تصادم وٹکراؤ کی صورت پیدا نہ ہوگی۔

باہمی احترام واکرام سے ان بہت سے مسائل کو حل کیا جاسکتا ہے جن سے عالم اسلام دوچار ہے؛ لہٰذا جن ملکوں میں غیر مسلم اکثریت کا زور وغلبہ ہے وہاں اس اکثریت اور مسلم اقلیت کے درمیان باہمی تبادلۂ خیال ضروری ہے اور جن ملکوں میں مسلم اکثریت کا غلبہ ہے وہاں پر اسلامی رجحان رکھنے والوں اور ان مسلم حکمرانوں کے درمیان تبادلۂ خیال اور ہم آہنگی ویکجہتی ضروری ہے جو اسلامی رجحان رکھنے والوں کو اپنے لئے خطرہ سمجھتے ہیں۔

لیکن آج صورت حال یہ ہوگئی ہے کہ دونوں فریق ہر مسئلہ میں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہوجاتے ہیں۔ اور چھوٹے چھوٹے مسئلوں میں متصادم ہوجاتے ہیں، اس میں مسلمانوں کی طاقت وتوانائی صرف ہورہی ہے اور وہ تعمیر اور اصلاح کے بجائے اپنے دفاع پر مجبور ہیں۔

اس صورت حال کا بنیادی سبب یہ ہے کہ فریقین کے درمیان اعتماد کا فقدان ہے، افکار وخیالات کے تبادلہ کا عنصر مفقود ہے اور حلم وبردباری کی روح ناپید ہے۔

پوری اسلامی دنیا میں اسی رویہ کی وجہ سے خانہ جنگی اور محاذ آرائی کی صورت حال سے دینی شعور رکھنے والوں اور دوسری جماعتوں کے درمیان محاذ آرائی کا بازار گرم ہے۔ اسی طرح مسلم حکمراں اور مسلم رعایا میں زبردست ٹکراؤ ہے اور پوری دنیا میں دینی رجحان کے علم برداروں اور مغربی تہذیب کے علمبرداروں میں صف بندی اور محاذ آرائی ہورہی ہے، مغربی تہذیب میں انسانی قدروں کا نام ونشان نہیں، بلکہ یہ ہر اس نظام کی مخالفت کرتی ہے جس میں ثابت شدہ اصول وعقائد ہیں اور مغربی تہذیب اس بات پر مصر ہے کہ پورے عالم میں

صرف اسی کا چلن ہو اور جو نظام اس کی مخالفت کرے اس کو ختم کر دیا جائے، سب سے زیادہ حیرت انگیز صورت حال وہ ہے جس میں مسلمان ایسے نظام سے دوچار ہیں جس میں مسلمان آزادی سے اپنے عقائد پر عمل نہیں کر سکتے اور نہ ہی آزادانہ اظہار رائے کا ان کو حق حاصل ہے، بلکہ ان پر اپنے خیالات و نظریات اور نظام تھوپے جاتے ہیں جو ان کے افکار و خیالات اور نظریات کے مخالف ہوتے ہیں حتی کہ اپنے ملکی حقوق بھی ادا نہیں کر سکتے۔ کہیں مساجد اور میناروں کی تعمیر پر پابندی ہے، کہیں حجاب پر پابندی ہے، کہیں اذان پر پابندی ہے اور اب بعض ملکوں میں نماز پر بھی پابندی لگائی جا رہی ہے۔

امتیاز و جانبداری اور دورخے پن کا یہ رویہ زندگی کے ہر میدان میں اپنایا جا رہا ہے، ایک طرف تو مکمل آزادی ہے اور دوسری طرف صرف محرومی ہی محرومی۔ یہی موقف محاذ آرائی کا سبب ہے، جب اس جانب دارانہ موقف میں نرمی آجائے گی تو ان خطوں میں جو ٹکراؤ کی آگ میں جل رہے ہیں، ہم آہنگی و یکجہتی، مساوات اور تبادلۂ خیال کا ماحول عام ہوگا، اور وہاں امن و آشتی کی فضا قائم ہوگی، لہٰذا دونوں فریقوں کو اپنے موقف کو بدلنا چاہیے، اور حکمت و مفاہمت کی روش اختیار کرنی چاہیے۔ تمام نزاعی مسائل کو گفت و شنید کے ذریعہ حل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور ان تمام طریقوں سے گریز کرنا چاہیے جن کی اساس ظلم و جور اور جبر و قہر پر اور عجلت پسندی پر قائم ہو اور جب بھی کوئی کارروائی کی جائے تو پہلے خوب غور کر لیا جائے۔ اگر ایسا کیا گیا تو ضائع ہونے والی قوتوں کے سرچشموں کی حفاظت ہو سکتی ہے اور انسانی طاقتوں کو بروئے کار لا کر مفید بنایا جا سکتا ہے۔ اور ان سب کے نتیجہ میں ایک ایسا مشکبار و خوشگوار ماحول و فضا تیار ہوگی جس میں اتحاد و اتفاق اور الفت و محبت کے گل و لالہ کھلتے نظر آئیں گے اور تمام قومی عناصر باہم شیر و شکر ہو کر پیام امن کا پرچم لہراتے ہوئے دکھائی دیں گے۔

ٹکراؤ سے دعوت کی طرف

موجودہ دور میں جو لوگ مسلمانوں کے مسائل اٹھاتے اور انہیں موضوع بحث بناتے ہیں، وہ اپنی ساری توجہ وتوانائی دشمنوں کی سازشوں، دسیسہ کاریوں اور ان کے منصوبوں پر صرف کرتے ہیں، ان وسائل پر زور دیتے ہیں جو دشمنان اسلام مسلمانوں کے خلاف رائے عامہ تیار کرنے اور اسلام کی شبیہ مسخ کرنے کے لیے اختیار کرتے ہیں، مسلمان جس پسماندگی، پستی، غربت وافلاس، بے کاری اور آپسی تنازعات سے دوچار ہیں، اس کی ذمہ داری مسلمانوں پر ہی ڈالی جاتی ہے، عالم اسلامی وعربی میں فساد و بگاڑ، خانہ جنگی، آپسی کشمکش اور خلفشار وانتشار کا سبب اسلام کو ٹھہراتے ہیں۔

لیکن حقیقت میں وہ اس بحث ومباحثہ کے پس پردہ مغرب کی خصوصیات کو اجاگر کرتے ہیں، ان مقالات میں یہ دکھایا جاتا ہے کہ مغربی ملکوں میں باہمی تعاون اور تال میل قائم ہے، مغرب نے تعلیم وتربیت کے میدان میں ترقی کی ہے، اقتصادی سیکٹر میں بہتری آئی ہے، اس کے پاس ایسے وسائل وذرائع ہیں جن کی بنا پر پسماندہ اور غریب ملکوں کی وہ مدد کرتا ہے؛ حالانکہ یہ پسماندہ ممالک آبادی اور طبعی وسائل وذخائر کے اعتبار سے مغربی ملکوں سے کہیں زیادہ فائق ہیں۔

اسی طرح سامراج کی طویل تاریخ پر بحث کی جاتی ہے جس میں یورپ نے پوری دنیا کو اپنے تسلط وقبضہ میں کرلیا اور اپنے مفادات کی خاطر اور توسیع پسندانہ عزائم کو بروئے کار لانے کے لیے مغلوب ملکوں کے وسائل کا استحصال کیا، پھر ان ملکوں میں ایسے عناصر اور افراد پیدا کردیے جو اپنے ملکوں کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں، انتشار، ٹکراؤ اور

کشمکش کا سبب بنتے ہیں اور اپنے عوام اور قوم کو اس پر مجبور کرتے ہیں کہ وہ غاصب ملکوں پر اعتماد کریں، ان سے مدد طلب کریں، حالانکہ ان غاصب ملکوں نے ان پسماندہ ملکوں کی دولت وثروت کا استحصال کیا اور ایک ایسی نسل تیار کر دی جو ایجنٹ کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں اور ان ملکوں کی نقالی اور تقلید کی ترغیب دیتے ہیں، جن ملکوں نے ان کو غلام بنایا اور مسلسل ان مظلوم ومغلوب ملکوں پر اقتدار وتسلط کا منصوبہ بناتے رہتے ہیں، عالم اسلام کی موجودہ صورت حال اس کی واضح دلیل ہے، بنگلہ دیش اور پاکستان سے لے کر مصر، شام، عراق، تونس اور لیبیا تک یہی یکساں صورت حال ہے۔

یقیناً یہ تمام پہلو اہم اور فیصلہ کن ہیں اور بہت سے مسلم ملکوں میں وسائل اور مشکلات پیدا کرنے میں ان کا اہم رول رہا ہے لیکن فطری طور پر یہاں ذہن میں ایک سوال ابھرتا ہے کہ وہ کون سی رکاوٹ ہے جو ان ملکوں کو سازشوں، چال بازیوں اور دسیسہ کاریوں سے نجات دلانے میں حائل ہو رہی ہے؟ اور تخریبی منصوبوں کا مقابلہ کرنے سے کون سی چیز مانع آ رہی ہے اور ذلت آمیز صورت حال سے چھٹکارا پانے کی ان کی کیا تیاریاں ہیں؟

ابھی گذری ہوئی صدی کے حالات پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ صرف عالم اسلام ہی مغربی سامراج اور مغربی منصوبوں کا نشانہ اور ہدف نہیں تھا اور تنہا یہی جنگوں، آزمائشوں اور مصائب ومشکلات سے دوچار نہیں ہوا؛ بلکہ بہت سے دوسرے ممالک بھی عالم اسلام سے زیادہ سخت آزمائشوں، پریشانیوں اور بڑی محرومی اور ظلم سے گذرے ہیں۔

جرمنی اور جاپان ایک طویل عرصہ تک جنگ سے دوچار رہے، بڑی مغربی طاقتوں کے ظلم وستم کا شکار ہوئے، لیکن یہ دونوں ملک زبردست تباہی وبربادی کے باوجود عالمی جنگوں کے نتائج واثرات سے چھٹکارا حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے، حالانکہ عالمی جنگوں نے ان دونوں ملکوں کو بالکل تباہ وبرباد کر ڈالا تھا؛ لیکن یہ دونوں ملک بڑی حوصلہ مندی اور اولوالعزمی کا ثبوت دیتے ہوئے دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو گئے، یہی نہیں؛ بلکہ جہد

مسلسل، عمل پیہم، بہتر منصوبہ بندی اور ملکی وقومی اتحاد کے ذریعہ عالمی طاقتوں کے برابر ہو گئے اور ان سے مقابلہ کرنے لگے۔

یہی صورتحال کمیونسٹ چین کے ساتھ بھی پیش آئی، ایک زمانہ تھا جب کہا جاتا تھا کہ چینی گمنامی کی زندگی گذار رہے ہیں، اور زندگی کے میدان میں ان کا کوئی رول نہیں، لیکن چین میں ایک ایسا انقلاب رونما ہوا جس نے صورتحال بدل دی، انقلاب کے بعد چین کو سرمایہ دارانہ نظام اور مغربی ملکوں کی طرف سے دھمکیوں، چیلنجوں اور دباؤ کا سامنا کرنا پڑا، اس کا بائیکاٹ کیا گیا، اس پر پابندیاں عائد کی گئیں، لیکن چین اپنے وسائل، افرادی قوت اور اپنی ذاتی صلاحیت وطاقت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بغیر کسی خارجی امداد وتعاون کے زندگی کے میدان میں ڈٹا رہا، پھر وہ وقت آ گیا کہ دنیا نے اس کے وجود کو تسلیم کر لیا اور اس کے لیے دروازے کھول دیے، اس کے بعد چین نے ان ملکوں کو جو اس سے برسر پیکار تھے اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ اس کے ساتھ تعاون کریں، اقوام متحدہ کا ممبر منتخب کر لیا گیا، یہی نہیں؛ بلکہ سلامتی کونسل میں اس کو ویٹو پاور کا حق حاصل ہو گیا، حالانکہ ایک وہ وقت تھا جب اس کے سامنے ترقی کی ساری راہیں بند کر دی گئیں، اس کا عرصہ حیات تنگ کرنے کے لیے سارے حربے استعمال کیے گئے، لیکن چین نے اپنی قوت ارادی، مضبوط اور ٹھوس منصوبہ بندی اور تنظیمی صلاحیت اور اپنے ملکی وسائل پر بھروسہ اور خود اعتمادی کے ذریعہ تمام پریشانیوں اور مصائب پر قابو پالیا، اس نے مخالف عالمی طاقتوں کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کیا اپنے اصول ونظریات اور اپنے فلسفۂ حیات پر مضبوطی سے قائم رہا، بڑی طاقتوں کے مطالبات اس نے تسلیم نہیں کیے، اور نہ ان سے نرم رویہ اختیار کرنے کی اپیل کی۔

مغرب نے کمیونزم کے خلاف جو جنگی مہم چلائی وہ سنگینی اور خطرناکی میں اس مہم سے کم نہیں جو آج مغرب اسلام کے خلاف چلا رہا ہے، عرصہ دراز تک کمیونزم، مغربی سامراجی ملکوں کی دشمن رہی اور مغرب نے بھی اس کے مقابلہ کے لیے اپنے سارے علمی، فکری،

ثقافتی، سیاسی اور عسکری وسائل استعمال کر ڈالے۔

شمال کوریا کے ساتھ بھی یہی صورتحال پیش آئی لیکن وہ بھی اپنے موقف پر ڈٹا رہا، اس نے مغرب کے کسی چیلنج اور دھمکی کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کیا اور آج بھی اس نے اس امریکہ کے سامنے سپر نہیں ڈالی جو کہ اس وقت عالمی سپر پاور ہے، اور نہ اس نے کسی دھمکی کی پرواہ کی، وہ پوری قوت کے ساتھ اب بھی اپنی پالیسی پر قائم ہے۔

گذشتہ صدی سے مغربی طاقتوں نے اسلام کو مرکز توجہ بنایا اور اسلام کو کمیونزم اور نازی ازم سے زیادہ خطرناک خیال کیا، اور اس کو صفحہ ہستی سے مٹانے اور بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے اپنی ساری طاقت وقوت لگادی ہے، لیکن اس صورتحال سے ڈرنے اور خائف ہونے کی چنداں ضرورت نہیں، بلکہ استقلال و پامردی، حوصلہ مندی اور اولوالعزمی، حکمت ودانشمندی، صبر وثبات، ٹھوس پلاننگ وتنظیم اور دینی واسلامی روح کے ذریعہ اس کا مقابلہ کرنے کی ضرورت ہے۔ امت اسلامیہ واحدہ کی صفوں میں اتحاد وتعاون، دینی وملی شعور، ایثار وقربانی، احساس ذمہ داری، دینی غیرت وحمیت اور صحیح اسلامی اسپرٹ پیدا کرنے کی ضرورت ہے، کیونکہ مغربی ملکوں نے کمیونزم اور نازی ازم کو ختم کرنے میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی تھی اور کمیونسٹ ملکوں نے فکری، ثقافتی اور قومی تشخص وشناخت باقی رکھنے کی جو کوشش کیں ان کو ناکام بنانے میں مغربی طاقتوں نے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا، لیکن باہمی اتحاد وتعاون، احساس خودی، اپنے وجود کی بقا کی فکر، ذاتی وسائل وذرائع پر اعتماد وبھروسہ اور کسی بھی قیمت پر سر تسلیم خم نہ کرنے کا عزم وارادے نے ان ملکوں کے تشخص کو باقی رکھا، اور ان ہی امتیازات وخصوصیات کی بنا پر ہر طرح کے چیلنجوں، منصوبوں اور دھمکیوں کا مقابلہ کیا، چنانچہ زندگی کے ہر میدان میں کامیابی وکامرانی سے ہمکنار ہوئے، اور جو ملک ان سے وسائل وقت میں ممتاز تھے ان سے فوقیت لے گئے اور زندگی کے ہر میدان میں اپنی شناخت اور قومی خصوصیت باقی رکھی۔

ایک فلسطینی وفد نے جنوب مشرقی ایشیا کی تحریک آزادی کے ایک لیڈر سے ملاقات کی، جس نے مغربی سامراجی طاقتوں کے خلاف کامیابی حاصل کی تھی، اس ملاقات کا مقصد یہ تھا کہ فلسطین کی جنگ آزادی میں اس سے مدد لی جاسکے، اور اس کے تجربات سے فائدہ اٹھایا جاسکے، لیکن اس لیڈر نے فلسطینی وفد کو بہت سخت جواب دیا اور کہا تم لوگ مجھ سے مشورہ لیتے ہو، حالانکہ میں نے تمہاری ہی روشن تاریخ سے مزاحمت و مقابلہ کا طریقہ لیا ہے اور تمہارے اسلاف کی جہادی روح سے بھرپور استفادہ کیا ہے، گویا اس لیڈر نے فلسطینی وفد کو بھلایا ہوا سبق یاد دلایا۔

دشمن سازشیں رچتے ہیں، منصوبے بناتے ہیں، یہ ان کا حق ہے کہ اپنے مخالفوں اور دشمنوں کے خلاف منصوبہ بندی کریں، مسلمانوں کو قرن اول میں مختلف قسم کے خطرات، چیلنجوں، سازشوں اور تخریبی منصوبوں کا سامنا کرنا پڑا، مسلمانوں کی روشن تاریخ اس کی گواہ ہے، لیکن مسلمانوں نے کبھی تو بے سروسامانی و بے بضاعتی کے ساتھ طاقتور دشمن کا مقابلہ کیا، اور کبھی فکری و ثقافتی یلغار کا سامنا کیا، جبکہ اس میدان میں بھی دشمن علم وفن کے اسلحہ سے لیس تھا، لیکن اس عدم توازن کے باوجود مسلمانوں نے اپنے عزم واستقلال، استقامت وعزیمت احساس خودی وخوداعتمادی، دین سے گہری وابستگی پر مضبوطی سے قائم رہنے کی بنا پر ہر طرح کے خطروں، چیلنجوں پر قابو پالیا، مسلمانوں کا یہ امتیاز تھا کہ وہ ہر مصیبت وخطروں کے وقت متحد ہوجاتے تھے اور استقلال و پامردی اور دینی وملی غیرت وحمیت کا ایسا ثبوت دیتے تھے کہ گویا سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوں، نئے نئے چیلنجوں اور غیر معمولی مصائب وآزمائش ان کے پائے ثبات میں ذرا بھی لغزش پیدا نہ کرسکے، وہ دشمنوں کے وسائل اور فوجی طاقت وقوت سے مرعوب نہ ہوئے، بلکہ چٹان کی طرح دشمنوں کے مقابلہ پر ڈٹے رہے، بڑے صبر واستقلال، غیرت وحمیت، خودداری و جوانمردی اور احساس خودی سے مشکلات ومصائب کا مقابلہ کیا، چنانچہ ان کی پریشانیاں دوور ہوگئیں، اور مصائب کے بادل چھٹ گئے۔

کسی بھی تحریک کی کامیابی اس کے طریقہ کار، پالیسی، عزم وارادہ، خود اعتمادی، احساس خودی، حقیقت شناسی اور دشمن کے عزائم ومنصوبوں سے واقفیت پر منحصر ہے، اور پھر اس واقفیت کی روشنی میں جد وجہد کے ہر میدان میں تیاری کی جائے، جب ہم عالم اسلام اور دنیا کے دوسرے ترقی یافتہ ملکوں کے درمیان موازنہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ دونوں کے درمیان بڑا فرق اور بہت بڑا خلا ہے، دنیائے اسلام کی قیادتیں احساس ذمہ داری اور دینی وملی اور قومی جذبہ سے خالی ہیں جبکہ مخالف قیادتیں ملی وقومی جذبات سے سرشار ہیں، حالیہ برسوں میں عالم عربی کے متعدد ملکوں میں رونما ہونے والے عوامی انقلابات اور انقلابات کے بعد پیدا ہونے والی صورت حال اس کی دلیل ہے۔

دنیائے اسلام نے انیسویں صدی عیسوی میں مغرب کی تقلید ونقالی شروع کی، اور اب تک اسی روش پر قائم ہے؛ حالانکہ تقلید ونقالی کا زمانہ مختصر ہوتا ہے، اس لیے کہ جب تقلید کرنے والا سن شعور کو پہنچتا ہے، تو نقالی کو چھوڑ کر ابداع اور جدت کا طریقہ اختیار کرتا ہے، اپنے لیے نیا راستہ تلاش کر لیتا ہے، پھر اپنے سابق استاذوں کے احکام قبول نہیں کرتا، اور یہ طبعی قانون ہے؛ لیکن دنیائے اسلام کی سیاسی قیادتیں یورپ کی دو صدیوں سے نقالی وتقلید کرتی چلی آرہی ہیں، یورپ کے فکری رجحانات اور سیاسی اور تہذیبی نظام کو اپنے ملکوں میں نافذ کر رہی ہیں، حالانکہ بہت سے مغربی مفکرین خود مغربی آئیڈیالوجی اور یورپی تصورات و نظریات پر تنقید کر رہے ہیں اور یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ مغربی آئیڈیالوجی نے انسانیت کو فائدہ کم نقصان زیادہ پہنچایا ہے۔

اس وقت عالم اسلام کا بڑا المیہ احساس خودی کا فقدان ہے، قومی، ملی وفکری امتیاز، اسلامی شناخت اور دینی وقار واعتبار بحال کرنے کے عزم وارادہ کا فقدان ہے، آپسی ٹکراؤ ہے، دین بیزاروں اور اسلام پسندوں کی آویزش ہے، اور دہشت گردی کے نام پر اسلامی عنصر کو کچلا جارہا ہے، دینی اور اسلامی تعلیم کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کی جارہی ہیں، اسلامی

تنظیموں اور اداروں اور اسلام پسند سیاسی قائدین پر پابندی لگائی جارہی ہے، دوسری طرف اسلام مخالف تنظیموں اور دین بیزار سیاسی تحریکوں کو کھلی آزادی دی جارہی ہے، یورپ کے اس نظریہ کا پروپیگنڈہ کیا جارہا ہے کہ ''مذہب کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں اور سیاست کا مذہب سے کوئی جوڑ نہیں'' اور اس سے بڑھ کر حکام کے ذہنوں میں یہ بٹھایا جارہا ہے کہ اسلام دہشت گردی اور تشدد کا مذہب ہے، اور ان کے ذہنوں اور دلوں میں اسلام کا خوف بیٹھ گیا ہے، یہ نتیجہ ہے اس فکر وفلسفہ کا جو قرون وسطی میں صلیبی جنگوں کے اثر سے یورپ میں پیدا ہوا، اور پھر یورپ نے اپنے اسکول، نظام تعلیم اور تربیتی وسائل کے ذریعہ اپنے یہاں تعلیم حاصل کرنے والوں کے ذہنوں کو اس فکر کے مطابق ڈھال دیا۔

دعوت اسلامی کے میدان میں کام کرنے والوں نے اس ''گمراہ کن تصور'' کا مقابلہ کرنے میں کوتاہی کی اور لوگوں میں اس کا تعارف نہیں کرایا کہ اسلام دین رحمت ہے، امن وآشتی کا مذہب ہے اور انسانی صلاح وفلاح کا داعی اور ضامن ہے، اس تعمیری فکر کو عام کرنے کے لیے ادارے بھی قائم نہیں کیے گئے کہ ان سے ایسے افراد تیار ہوکر نکلتے جو سیاست ومعیشت، تمدنی اور سلامتی اداروں میں کام کرتے اور سماج کے تمام شعبوں میں ان کا اثر ورسوخ قائم ہوتا، اگر ایسا ہوجاتا تو انگلیوں پر گنے جانے والے چند وظیفہ خوار حکام اور سیاسی قائدین مسلم اقوام پر اپنی مرضی نہ تھوپ پاتے اور نہ خارجی طاقتوں کے منصوبوں اور مطالبوں ہی کو نافذ کرپاتے۔

مغرب کی چالبازیوں، دسیسہ کاریوں، سازشوں، عیاری ومکاری، دجل وفریب، خیانت وغداری، جانب داری اور حقارت آمیز سلوک کا تجربہ ہوجانے کے بعد اب یہ وقت آگیا ہے کہ عالم اسلام اپنی ذات اور اپنی خودی کی طرف لوٹنے کی فکر وکوشش کرے، خودداری، عزت نفس، صبر واستقلال، تحمل وبردباری کی صفات سے متصف ہو، قومی عزت وشرافت اور ملی امتیاز کا یہ تقاضہ ہے، آج عالمی طاقتوں کی جانب سے مسلم ملکوں سے نصاب

تعلیم، طریقہ تعلیم و تربیت اور دیگر امور میں تبدیلی کا مطالبہ کیا جارہا ہے، بلکہ بعض ملکوں میں عملی طور پر اس مطالبہ کو پورا بھی کیا جارہا ہے، اس کا مقابلہ بغیر عزم راسخ، جہد مسلسل، عمل پیہم اور مضبوط وٹھوس پلاننگ کے نہیں کیا جا سکتا، موجودہ چیلنجوں اور مصائب وفتن اور موجودہ حالات کا مقابلہ صحیح عقیدہ، اسلامی اقدار وروایات، دینی واسلامی شعائر کی پابندی و حفاظت، سنت نبوی اور صحابہ کرام کے طریقہ کار کو اپنا کر ہی کیا جا سکتا ہے، ان تمام سیاسی قائدین سے (جو اسلام دشمن طاقتوں پر تکیہ کئے ہوئے ہیں) وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ اپنے موقف میں تبدیلی لائیں، تقلید کو چھوڑ کر خود اعتمادی اور خود اپنے وسائل پر بھروسہ کریں، امت مسلمہ کا اپنے اپنے قائدین سے مطالبہ ہے کہ وہ فیصلہ کن موقف اختیار کریں، جب رہنماؤں میں احساس وشعور پیدا ہوجائے گا اور صحیح موقف اختیار کرلیں گے تو ان کو اپنی قوم سے بھر پور تعاون ملے گا، اور عالم اسلام کے مختلف حصوں میں حکمراں طبقہ اور عوام کے درمیان جو کشمکش جاری ہے وہ فطری طور پر ختم ہوجائے گی، اس کا مشاہدہ موجودہ ترکی میں کیا جاسکتا ہے۔

جو لوگ اپنے ملک کے نظام حکومت کے خلاف غصہ اور ناراضگی کا اظہار کرتے ہیں اور اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہیں ان کو بھی چاہئے کہ وہ دانائی وحکمت سے کام لیں، اور حکمراں طبقہ کو مطمئن کرنے کے لیے سنجیدہ طریقہ اختیار کریں، ردعمل اور تنقید کا راستہ چھوڑ کر دعوت واصلاح اور مفاہمت کا راستہ اختیار کریں، کیونکہ ٹکراؤ کے راستہ نے امت کو بہت نقصان پہنچایا ہے، لہٰذا تصادم کی راہ چھوڑ کر مفاہمت اور حکمت پر مبنی دعوت کا طریقہ استعمال کر کے حکمراں طبقہ کو مطمئن کریں اور ان کے اندر دینی وملی غیرت وحمیت اور احساس خودی پیدا کریں، اس لیے کہ آج امت کو جو مسائل درپیش ہیں ان سے گلو خلاصی کا واحد راستہ یہی ہے ارشاد ربانی تعالیٰ ہے:

"ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم

بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَن ضَلَّ عَن سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُم بِهِ وَلَئِن صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصَّابِرِينَ وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوا وَّالَّذِينَ هُم مُّحْسِنُونَ". [سورۃ النحل/۱۲۵-۱۲۸]

''اپنے پروردگار کی طرف بلایئے حکمت سے اور اچھی نصیحت سے، اور ان کے ساتھ بحث کیجئے، پسندیدہ طریقہ سے، بیشک آپ کا پروردگار (بھی) خوب جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور وہی ہدایت پائے ہوؤں کو (بھی) تو خوب جانتا ہے اور اگر تم لوگ بدلہ لینا چاہو تو انہیں اتنا ہی دکھ پہنچاؤ جتنا دکھ تمہیں پہنچایا گیا ہے، اور اگر تم صبر کرو تو یہ صبر کرنے والوں کے حق میں بہت ہی اچھا ہے، آپ صبر کئے رہئے اور آپ کا صبر تو بس اللہ ہی کی توفیق سے ہے، اور آپ ان پر غم نہ کیجئے، اور ان چالوں سے جو یہ لوگ چلتے رہتے ہیں تنگ دل نہ ہو جایئے، بے شک ان لوگوں کے ساتھ (رہتا ہے) ہے جو تقویٰ اختیار کیے رہتے ہیں اور جو لوگ نیکوکار ہیں۔''

لہٰذا موجودہ صورتحال میں اسلامی تنظیموں اور تحریکوں کی ذمہ داری ہے کہ ٹکراؤ اور مزاحمت کا راستہ چھوڑ کر اصلاح و دعوت کا راستہ اختیار کریں، حکمت و تدبر کے ساتھ منظم انداز سے اشتعال انگیزی اور خودنمائی سے بچتے ہوئے کام کریں، ذہن سازی کریں، اسلامی تعلیمات کے لیے زمین ہموار کریں، دین و دنیا کا جامع اور ہمہ گیر اسلامی نظام حیات کو عملی طور پر پیش کریں اور اسلام اور مسلمانوں کے تئیں پائے جانے والے شکوک و شبہات کا ازالہ موثر اور مطمئن کرنے والے انداز میں کریں، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی لکھتے ہیں:

''دینی دعوت وتبلیغ اور اسلامی تجدید کا کام اتنا آسان نہیں ہے جتنا کہ سمجھ لیا گیا ہے، اس کا کام اور پیغام صرف اتنا نہیں ہے کہ ایک نظام کی جگہ دوسرا نظام، اور ایک سیاسی واقتصادی نظام کی جگہ دوسرا سیاسی واقتصادی نظام لایا جائے، نہ علم وثقافت کو عام کرنا، جہالت کو مٹانا، بے کاری وبے روزگاری کے خلاف جنگ چھیڑنا ہے اور نہ ہی معاشرتی واخلاقی خرابیوں کا علاج اس ڈھنگ سے کرنا ہے جس طرح یورپ کے مصلحین اور مغرب کے رفارمر کیا کرتے ہیں، اس دعوت کا کام تو اس ''اسلام'' کی طرف بلانا ہے جو عقیدہ، عمل، اخلاق وکردار، عبادت وسیاست، انفرادی واجتماعی سلوک سب پر حاوی ہے، اس میں قلب، ذہن ودماغ اور جسم وروح شامل ہیں، کوئی چیز اس کے دائرۂ بحث سے خارج نہیں، اس دعوت میں دل، دماغ، انداز فکر، انسانی نفسیات، عقائد، ذہنیت سب کے اندر گہری تبدیلی لائی جاتی ہے، اس دعوت کا سرچشمہ قلب ہے، نہ کہ قرطاس وقلم اور تقریر کا اسٹیج، یہ وہ دعوت ہے جو امت پر نافذ ہونے سے پہلے داعی کے جسم پر نافذ اور اس کی پوری زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے''۔

اسلام پر فخر اور اس سے وابستگی

امت مسلمہ کی سربلندی وسرفرازی کا راز

بیسویں صدی کے چالیس کی دہائی میں بہت سے مسلم ملکوں میں اقتدار کی باگ ڈور مسلمانوں کے ہاتھ میں آئی، تعلیم، معیشت اور سماج کی تشکیل وتربیت کا نظام مسلمان ذمہ داروں نے سنبھالا، اور ایسا ماحول بنا کہ ان میں سے کسی کو بھی اسلام کی طرف نسبت کرنے یا مسلم سماج کا فرد ہونے میں کوئی جھجھک محسوس نہیں ہوئی، یہاں تک کہ بعض حکام نے برملا اس کا اظہار کیا کہ وہ اپنے ملک میں مسلم اکثریت کے نمائندہ ہیں، بعضوں نے اعلان کیا کہ اسلام ملک کا سرکاری مذہب ہے، بہت سے ملکوں کے دستور میں اس کا اندراج بھی کیا گیا، لیکن اس سب کے باوجود آج بھی مسلم دنیا میں حقیقی اسلام زندگی سے الگ تھلگ اور اجنبی بنا ہوا ہے، ملت اور حکام دونوں ہی میں دین بیزاری نمایاں ہے، بلکہ زندگی کے شعبوں میں اسلامی تعلیم وتربیت کا فقدان ہے، نہ تو خیر امت کا پیغام ومزاج نظر آتا ہے اور نہ ہی اسلامی زندگی کے آثار ونقوش۔

جن ملکوں کو ہم ''اسلامی'' کہتے ہیں وہ صرف اس معنی میں ''اسلامی'' ہیں کہ یہاں کی اکثریت دین اسلام کو مانتی ہے اور یہاں کے حکام مسلم اکثریت سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن اسلام یہاں آج بھی اجنبی ہے؛ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اسلام سے جنگ کی جارہی ہے اور اس کو ملک سے نکالا جارہا ہے تو اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہوگا، عالم اسلام کی آج وہی صورت حال ہے جو مغربی سامراج کے عہد میں تھی، حالانکہ بین الاقوامی قوانین میں اس کی صراحت ہے کہ اقلیتوں اور تمام طبقات انسانی کے جذبات، عقائد، تہذیب وثقافت اور ان کے دینی

شعائر کا احترام اور خیال رکھا جائے ، ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ حکومتیں اور ان کی سیاست اکثریت کے عقیدہ اور اس کے جذبات سے نہ ٹکراتی، بلکہ اسلامی اکثریت کی بنیاد پر اس کے عقیدہ کی پاسداری وحفاظت کرتیں، لیکن بدقسمتی سے عالم اسلام کے بہت سے حکام نے اسلام مخالف رویہ اختیار کیا، اسلامی ثقافت کو مسخ کیا، اور اسلامی قدروں کی بات کرنے والوں کو کچل دیا، یہی وہ تلخ حقیقت ہے جس سے اس وقت پورا عالم اسلام دوچار ہے، حکام اور رعایا میں کوئی تال میل نہیں، دونوں کے فکر وعمل میں بُعد اور ٹکراؤ ہے، یہ وہ صورت حال ہے جو سامراج اور سامراج کے تابع قوم کی ہوتی ہے۔

سامراج نے سلبی قومیت کا ذہن پیدا کیا، اور پھر زندگی کی تمام سرگرمیاں اس کے رنگ میں رنگ گئیں، سیاسی قائدین اس عقیدہ (ذہنیت) پر ایک طرح کا ایمان لے آئے، لیکن اس ذہنیت نے عالم اسلامی میں بہت سی قومیتیں پیدا کردیں، بلکہ قومیت در قومیت، پھر اس ذہنیت نے ملت اسلامیہ کو عربی، تورانی، کردی، دروزی، بربر اور فرعونی قومیتوں میں بانٹ دیا، جو مغرب کے غلبہ وبرتری اور مسلمانوں کی پسماندگی پر ایمان لے آئیں، اس کے نتیجہ میں اسلام اور مسلمانوں کو پسماندہ اور اسلام کی دعوت کو پستی اور کمزوری کی علامت سمجھا جانے لگا، دوسری طرف مغرب کی نقالی اور اس کی غلامی کو ترقی اور طاقت کا ذریعہ سمجھ لیا گیا، چنانچہ ملت اسلامیہ احساس کمتری اور غلامی کا شکار ہوگئی، کسی ملک میں حقیقی ترقی ہوئی اور نہ ہی امن وامان اور استحکام قائم ہوا اور نہ ہی اتحاد، بلکہ قومیت کی ذہنیت نے نئی نئی مشکلات اور مسائل پیدا کردیے، اور مغرب کی پچاس سالہ غلامی اور سلبی قومیت نے امت مسلمہ میں مزید انتشار وخلفشار، جمود وتعطل اور ٹکراؤ پیدا کردیا۔

اسلام نے ایک امت، باہمی ربط وتعلق، آپسی یگانگت ومحبت اور امت واحدہ کا فرد ہونے پر فخر کی دعوت دی ہے، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّه﴾ [سورہ آل عمران:۱۱۰] (تم

بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے برپا کی گئی ہے، تم بھلائی کی تلقین کرتے ہو، اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو) اسلام نے بکھراؤ، ٹکراؤ اور انتشار سے منع کیا ہے۔

﴿وَاعْتَصِمُواْ بِحَبْلِ اللّهِ جَمِيعاً وَلاَ تَفَرَّقُواْ وَاذْكُرُواْ نِعْمَتَ اللّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنتُمْ أَعْدَاء فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُم بِنِعْمَتِهِ إِخْوَاناً وَكُنتُمْ عَلَىَ شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَأَنقَذَكُم مِّنْهَا كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ، وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَأُوْلَـئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ [سورہ آل عمران:۱۰۳-۱۰۴]

اور اللہ کی رسی کو تم سب مل کر تھامے رہو، اور پھوٹ مت ڈالو، اور اپنے اوپر اللہ کے احسان کو یاد رکھو، جب تم آپس میں دشمن تھے، تو اس نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا، تو اس کے احسان سے تم بھائی بھائی ہو گئے اور تم جہنم کے گڑھے کی ڈھک پر تھے تو اس نے تمہیں اس سے بچالیا، اسی طرح وہ تمہارے لیے آیتیں کھول کھول کر بیان کرتا ہے، تاکہ تم راہ پر رہو، اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہئے جو خیر کی طرف بلاتی رہے اور بھلائی کے لیے کہتی رہے، اور برائی سے روکتی رہے اور یہی لوگ اپنی مراد کو پہنچنے والے ہیں۔

اس آیت کریمہ میں وضاحت کر دی گئی ہے کہ یہی امت کامیاب، راہ یاب، پسندیدہ اور منتخب امت ہے، لیکن اس کے لیے کچھ شرائط اور خصوصیات رکھی ہیں جو اسے دوسری قوموں سے ممتاز کرتی ہیں، جن کی بنیاد مختلف قومیتوں، تہذیبوں، زبانوں، ملکوں اور فلسفوں پر ہے، امت مسلمہ خیرِ امت ہے، جس کا مشن خیر کی اشاعت، بھلائی کی تلقین، انسان کو غلامی سے آزاد کرانا، بندہ اور معبود کے درمیان صحیح رشتہ اُستوار کرنا، انسان کے اخلاق وسلوک کی صحیح تربیت وآبیاری اور روئے زمین پر اللہ کی جانشینی کے لائق بنانا ہے۔

تاریخ کے مختلف ادوار میں اس امت کی بنیادی خصوصیت بھلائی کی طرف بلاتے

رہنا، برائی سے روکتے رہنا، اللہ پر ایمان رکھنا اور اس کی طرف دعوت دیتے رہنا رہی ہے، اس امت کی بنیادی ذمہ داری یہی ہے کہ بھلائی کی طرف بلاتی رہے، برائی سے روکتی رہے، اور انسان کو صحیح رخ پر چلانے کا کام کرتی رہے، یہ امت نہ تو کبھی شر سے مصالحت کرسکتی ہے اور نہ ہی برائی کے سلسلہ میں سستی اور کوتاہی، اس لیے کہ روئے زمین پر غلبہ اور اقتدار کا حصول مشروط ہے امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور اللہ پر ایمان سے۔

﴿وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا وَمَن كَفَرَ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ، وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ﴾

[سورہ نور: ۵۵-۵۶]۔

تم میں جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے بھلے کام کیے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ اللہ تعالی ان کو ضرور زمین میں حاکم بنائے گا، جیسا اس نے ان کے پہلوں کو حاکم بنایا، اور ان کے لیے ان کے اس دین کو ضرور طاقت عطا فرمائے گا جس کو اس نے ان کے لیے پسند کرلیا ہے، اور ضرور ان کے خوف کو اطمینان سے بدل دے گا، بس وہ میری بندگی کرتے رہیں، میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں اور جس نے اس کے بعد بھی انکار کیا تو وہی لوگ نافرمان ہیں، اور نماز قائم رکھو اور زکوۃ دیتے رہو اور رسول کی بات مانتے رہو تا کہ تم پر رحمت ہو۔

لہٰذا اس امت کا روئے زمین پر غلبہ، اقتدار اور استحکام اسی وقت قائم ہوسکتا ہے جبکہ یہ اپنی مفوضہ ذمہ داری پوری کرے، دعوت الی اللہ کا کام کرے، کرپشن، سرکشی، ظلم، اور طاغوتی طاقتوں کا مقابلہ کرے، عدل وانصاف قائم کرے، اور ایسا معاشرہ قائم کرے جو امت منتخبہ کا مصداق ہو۔

تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ جب بھی اس امت نے روئے زمین پر غلبہ واقتدار کے شرائط پورے کیے، اپنا مطلوبہ کردار ادا کیا تو اسے غلبہ وحکمرانی حاصل ہوئی، اور اس نے دنیا کی قیادت کی، تاریخ اسلامی میں جو بھی حکومت قائم ہوئی اس کی بنیاد دعوت الی اللہ، عقیدہ واخلاق کی اصلاح رہی ہے، لیکن جب مغربی تہذیب کا دور شروع ہوا، اور امت نے اس کے وسائل زندگی اور اس کے قائدین کے افکار وخیالات کی تقلید کی اور دعوت الی اللہ کا کام چھوڑ کر مادی تہذیب میں غرق ہوگئی تو یہ کمزوری اور زوال کا شکار ہوگئی، اور قیادت وسیادت دوسری قوم میں منتقل ہوگئی۔

تاریخ اسلامی کے مختلف ادوار کا مطالعہ کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ جب بھی اسلامی حکومت وجود میں آئی تو اس کے قیام میں اقتدار اور اس کے تقاضوں کے درمیان یہی مضبوط ربط وجوڑ کارفرما تھا اور اس کے زوال کا سبب اس کی سستی اور استخلاف فی الأرض کے تقاضوں سے انحراف رہا، اور یہ بار بار ہوا ہے، تاریخ کے ہر دور میں عبرت کا سامان موجود ہے۔

تاریخ اسلامی کی یہ عجیب بات ہے کہ ہر وہ حکومت جس نے کوئی قابل ذکر کارنامہ انجام دیا، اس کا قیام دعوت اسلامی کے سایہ میں ہوا، غلبہ واقتدار دینی جذبہ ہی کے تحت حاصل ہوا، اور زوال اور پستی کا سبب ہمیشہ پرعیش زندگی اور تمدن کی ریل پیل رہا، اس کی مثال اندلس، مصر، بغداد، ہندوستان، ایران اور ترکی ہے، ان ممالک میں عظیم حکومتیں قائم ہوئیں اور صفحۂ ہستی سے مٹ گئیں، حکمراں خاندانوں کے فرق سے یہ صورت حال ہر دور میں نظر آتی ہے، اسلامی حکومتوں کے عروج وزوال کی تاریخ پر نظر رکھنے والوں کو یہ معلوم ہے کہ اسلامی حکومت اور غلبہ علماء اور دینی پیشواؤں کی سرپرستی ورہنمائی میں قائم ہوا، جب تک اسلامی حکومتیں علماء دین کی سرپرستی میں رہیں تو طاقت وقوت حاصل رہی، فتوحات اور حکومت کا دائرہ وسیع رہا، لیکن جب علماء اور دینی پیشواؤں کی سرپرستی نہ رہی، مادی ذہن کے حکمراں آگئے، علماء کا اثر ورسوخ ختم ہوگیا، اور ان کے فتوؤں کی توہین کی جانے لگی تو

اسلامی حکومت کا دائرہ تنگ ہونے لگا، یہاں تک کہ امت مسلمہ اقتدار وقیادت کے منصب سے محروم ہوگئی، پوری اسلامی تاریخ اس کی گواہ ہے۔

آخری عہد کی اسلامی حکومت جس نے دنیا کی قیادت سنبھالی تقریباً ساڑھے چھ سو سال بڑے کروفر کیساتھ حکمرانی کی، تاریخ کے صفحات پر انمٹ نقوش چھوڑے اور دنیا کا نقشہ بدل دیا، یہ عثمانی حکومت ہے، جس نے ایشیا، افریقہ اور براعظم یورپ کے بڑے رقبہ پر حکمرانی کی، اس کے بانی متحارب قبائل سے تعلق رکھتے تھے، جو ایشائے کوچک میں آباد تھے، ان کی زندگی وحشیانہ تھی، ان کا مشغلہ لوٹ کھسوٹ، قتل وغارتگری اور خونریزی تھا، تمدن سے بالکل ناآشنا تھے، لیکن جب یہ خاندان قیادت وسیادت کے افق پر نمودار ہوا تو متحد ہوگیا اور ایک ایسی طاقت بن گیا جس نے دنیا کے رخ کو بدل دیا، پورے یورپ سے ٹکر لی اور ان کو شکست دی۔

عثمانیوں کو یہ کامیابی، اقتدار اور غلبہ اس لیے حاصل ہوا کہ انہوں نے دعوت الی اللہ کے فریضہ کو پورا کیا، دین کی تعلیمات پر عمل اور اس کے تقاضوں کو پورا کیا، علماء اور مذہبی پیشواؤں سے رابطہ رکھا، بلکہ ان کی باتوں اور فتوؤں پر عمل کیا، اور علماء دین کی سرپرستی وتربیت میں رہے۔

محمد جمیل بیہم نے اپنی کتاب ''فلسفة التاريخ العثمانی ''میں لکھا ہے کہ ''جب آل عثمان کی حکومت وجود میں آئی تو اس وقت ترک نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے تھے، عرب اور دیگر مسلم قوموں میں نئی تہذیب وتمدن کے اثر سے دینی جذبہ سرد پڑ چکا تھا، لیکن ترکوں کے دلوں میں ایمان کی انگیٹھی روشن تھی، اور دینی جذبہ شعلہ جوالہ بنا ہوا تھا، جوان کو آمادہ کر رہا تھا کہ وہ اب عربوں سے قیادت وسیادت کا منصب سنبھال لیں، اسلام کی نمائندگی کریں، اور یہ دینی جذبہ شریعت سے ان کی گہری وابستگی، علماء کا احترام واکرام اور ان کی سرپرستی کا نتیجہ تھا، اسی لیے دولت عثمانیہ میں شریعت اور علماء شریعت کا بڑا اثر ورسوخ تھا''۔

دولت عثمانیہ اپنی تاسیس کے زمانہ میں کلی طور علماء کے زیر اثر تھی اور مفتی اعظم سے

رجوع کے بعد ہی کوئی قدم اٹھایا جاتا یا کوئی فیصلہ لیا جاتا، سلطنت عثمانیہ میں مفتی اعظم کو شرعی اور شہری امور میں سلطان کا خود مختار نائب سمجھا جاتا تھا۔

تاریخ کے ہر دور میں جس حکمراں خاندان نے کوئی کارنامہ انجام دیا، اس کا شعار دین اور علماء دین کا احترام رہا، اسلامی حکومت کو صحیح خطوط پر چلانے میں علماء کا جرأتمندانہ رول رہا، اور علماء کی صحیح رہنمائی نے تاریخ کا رخ موڑ دیا، اسلامی اقتدار کی مضبوطی، وسعت اور اس کے پھیلاؤ میں علماء دین نے ہمیشہ بڑا کردار ادا کیا، علماء دین اور حکام کے درمیان ربط وجوڑ کی مثالیں تاریخ میں موجود ہیں، اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ اسلامی حکومت کی حقیقی طاقت وقوت علماء دین سے ربط وتعلق، دین وشریعت سے مضبوط اور سچی وابستگی، دین کے احترام، دینی غیرت وحمیت، اسلامی اخوت اور ملت کی اجتماعیت ووحدت میں پنہا ہے۔ ہندوستان کی تاریخ میں اس کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔

اسلامی ہندوستان میں علماء ربانیین حکمرانوں کے ساتھ رہتے تھے، جنگوں میں شریک ہوتے، ان کی رہنمائی کرتے اور جنگ کے نتیجہ کو مضبوط کرتے، اور اپنی دعوتی کوششوں سے ان کو تقویت بہم پہنچاتے، ہندوستان میں اسلامی حکومت کا قیام اسی وقت عمل میں آسکا جب شیخ معین الدین چشتی نے یہاں اقامت اختیار کرلی تھی، چنانچہ ان کے قیام نے ہندوستان میں اسلامی حکومت کو مضبوطی اور تقویت فراہم کردی۔

آخری عباسی خلیفہ مستعصم کو جب متنبہ کیا گیا کہ مغل حملہ آور ہیں، اور عراق پہنچنے سے پہلے ہی خراسان کی سرحد پر ان کو روک دیا جائے تو مستعصم نے جواب دیا: بغداد میرے لیے کافی ہے، اور میں جب مغلوں کے لیے پورا ملک چھوڑ دونگا تو وہ بغداد میرے لیے چھوڑ دیں گے، چنانچہ جب ہلاکو خاں کی فوجیں پہنچیں تو مستعصم ہدایا وتحائف کے ساتھ بغداد سے ان کے استقبال کے لیے نکلا، لیکن یہ گرانقدر تحائف کچھ کام نہ آئے، بلکہ ہلاکو خاں نے اسکو اس کے اہل خانہ کے ساتھ پھانسی دیدی، اور اس کی فوج بغداد میں داخل

ہوگئی اور وہ کہرام مچایا اور خونریزی کی جس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی، عباسی حکومت ختم ہوگئی، مغل فوجی بڑھتے بڑھتے شام پہنچ گئے، اور مسلمانوں کا قتل عام کیا، اور یہ مشہور ہوگیا تھا کہ مغل ایسی طاقت ہیں جس کو مغلوب نہیں کیا جاسکتا۔

دوسری طرف مصر میں ایک ایسا شخص کرسی اقتدار پر متمکن ہوا جس کا حسب ونسب عالی نہیں تھا، نہ وہ عربی تھا اور نہ آزاد، بلکہ غلام تھا، لیکن زندگی سے لبریز، اللہ کے وعدہ پر مطمئن، اور بلند حوصلہ وعالی ہمت تھا، لہٰذا جب اس میں غیرت وحمیت بیدار ہوئی، تو اس نے مغلوں کے اس سیل رواں کو روکنے کا عزم مصمم کرلیا، جو شام کے بعد مصر کے لیے خطرہ بن گیا تھا، اس مصری قائد ظاہر بیبرس نے فلسطین کے عین جالوت میں ۶۵۸ھ میں مغلوں کے شیرازہ کو پاش پاش کردیا اور مغلوں کو کسی نے پہلی مرتبہ عسکری شکست دی، لیکن ظاہر بیبرس نے اس فوجی کامیابی پر قناعت نہیں کی، بلکہ اس نے طے کرلیا کہ اس خطرہ کو بالکل ختم کرنا ہے، اس کے لیے ظاہر بیبرس نے یہ مناسب سمجھا کہ مغل تمام کے تمام اسلام میں داخل ہوجائیں، چنانچہ اس نے مغلوں کو اسلام کی دعوت دی اور ان کی ایک جماعت اسلام میں داخل ہوگئی، اور پھر دھیرے دھیرے یہ خطرہ ختم ہوگیا، ملک ظاہر بیبرس کا علماء دین سے گہرا ربط تھا، چنانچہ علماء دین کے تعاون سے اس نے وہ مہم سر کرلی جس سے عباسی خلیفہ عاجز رہا۔

دولت عثمانیہ کے بانی عثمان اول ہمیشہ کوشاں رہے کہ علماء وصلحاء حکومت سے قریب رہیں، ان کے لیے مدارس اور مساجد تعمیر کیں، اپنے زمانہ کے شیخ وقت کے تقوی سے برکت حاصل کرنے کی خاطر ان کی بیٹی سے نکاح کیا، اس کی زندگی بڑی زاہدانہ ومتقشفانہ تھی، جب وقت موعود آگیا تو اس نے اپنے بیٹے اورخان کو اتباع دین، احترام علماء، رعایا کے ساتھ شفقت ورحمت کا معاملہ کرنے اور جہاد کی تلقین کی، لہٰذا اورخان نے اپنے والد کی وصیت پر عمل کیا اور علماء سے ہمیشہ تعلق قائم رکھا۔

مراد ثانی متقی، پرہیزگار، دین اور علماء دین کا قدرداں تھا، کوئی بھی علاقہ فتح کرتا تو

وہاں ایک مسجد، مدرسہ اور خانقاہ تعمیر کرتا، اسی طرح بایزید ثانی بن محمد رمضان کے اخیر عشرہ میں عبادت کے لیے گوشہ نشیں ہو جاتا۔

سلطان سلیم دین کا احترام کرتا، علماء کی قدر دانی کرتا، جب حلب کی ''ملک ظاہر جامع مسجد'' کے خطیب نے اسے ''مالک الحرمین'' کا لقب دیا تو اسے ناپسند کیا اور کہا: میرے لیے فخر کی بات یہ ہے کہ میں حرمین شریفین کا خادم رہوں، جب قاہرہ پہنچا تو سب سے پہلے جامع مسجد گیا اور مسجد کے سنگ مرمر پر پڑے ہوئے کپڑا کو اٹھا کر اپنی پیشانی پر رکھا، اور اتنا رویا کہ اس کو تر کر دیا۔

عباسی خلیفہ مستعصم اس پر قانع تھا کہ بغداد باقی رہے، یہی اس کے لیے کافی ہے، عثمانی خلیفہ بایزید بن مراد اتنا بلند ہمت اور بلند حوصلہ تھا کہ ایک فرانسیسی قائد سے جس کو گرفتار کر لیا تھا اور پھر اس رہا کر دیا، کہا: جاؤ، اور قسم کھالو کہ تم مجھ سے دوبارہ جنگ کے لیے آو گے، اس لیے کہ میرے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ اور محبوب یہ ہے کہ میں پورے یورپ سے لڑوں اور اس پر فتح حاصل کروں، بایزید دشمنوں کے لیے بجلی سے کم نہ تھا، اس نے یورپ کی متحدہ افواج کو شکست فاش دی۔

ایک مرتبہ سلطان سلیم نے دنیا کا نقشہ دیکھا اور اس کو بہت چھوٹا سمجھا اور کہا: کیا یہ زمین ایک بادشاہ سے زیادہ کے لیے وسیع ہو سکتی ہے؟۔

ان مذکورہ بالا مثالوں سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ ترقی یافتہ کون ہے؟ پورے یورپ پر قبضہ کرنے والا اور زمین معمولی سمجھنے والا، یا پھر یورپ کے پیچھے پیچھے چلنے والا؟ جسے اس پر فخر ہے کہ وہ یورپ کا خوشہ چیں اور اس سے ڈرتا ہے، اور اس کا ملک دولت عثمانیہ کے ایک چھوٹے سے حصہ کے برابر بھی نہیں جس نے اپنی اور ملک کی حفاظت کی ذمہ داری غیروں کے حوالہ کر رکھی ہے، بلکہ تعلیم و تربیت اور عقلی و ذہنی تشکیل کا نظام یورپیوں کے ہاتھ میں دے رکھا ہے۔

موجودہ انقلابی طاقتیں جو یورپ کے پروردہ مصطفیٰ کمال کے نقش قدم پر چل رہی ہیں، بچکانہ حرکتیں کر رہی ہیں، ان قیادتوں نے مغرب کے کاندھے پر بیٹھ کر ترقی کرنے کو ترجیح دی، اور اس کے لیے مغرب کا سفر کیا، لیکن افسوس ان کے حصہ میں مغرب زدگی بھی نہیں آئی، بلکہ صرف مفلسی وغربت ہاتھ لگی، مسکینوں بلکہ یتیموں کی طرح جی رہے ہیں، ان کو یہ یتیمی مبارک ہو، اب ان کو کبھی بھی وہ مقام نہیں مل سکتا، اس کا واحد راستہ یہی ہے کہ اپنے پیروں پر کھڑے ہوں، اپنے ہی سرمایہ اور تجربات سے کام لیں، اس لیے کہ اس امت کی طبیعت اور اس کا مزاج دینی اور دعوتی ہے، اللہ تعالیٰ اس امت میں دین ہی کے ذریعہ تبدیلی وبہتری لائے گا، یہی قرآن کریم کا حکم ہے، اور یہی قدیم وجدید تاریخ کا سبق، یہ امت اسلام ہی کے ذریعہ معزز وسربلند ہوسکتی ہے اور بغیر اس کے لاچار ومجبور رہے گی۔

اسلام فلسفہ نہیں نظام حیات ہے

مغربی سامراج کے عہد میں مستشرقین کی جانب سے اٹھائے گئے شکوک وشبہات کا ازالہ، علم جدید کی روشنی میں اسلام کا تعارف اور مغربی تہذیب کے مضر اثرات کی نشاندہی ایک مثبت علمی اور دعوتی کام تھا جو ان اہل علم وفکر نے انجام دیا جو مغربی تہذیب کے منفی اور ایجابی پہلوؤں سے واقف تھے اور ان میں سے بعض کو مغربی تہذیب کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا اور ان کو مغربی فکر کے مطالعہ کا بھی موقع ملا تھا، ان کی مخلصانہ علمی ودعوتی کاوشوں کے نتیجہ میں ایک بڑا کتب خانہ وجود میں آیا جس کی مدد سے مغربی فکر اور تہذیب سے متاثر ذہنوں تک رسائی حاصل ہوئی اور مرعوبیت اور دفاعی پوزیشن سے دعوتی اور تقابلی انداز فکر پیدا ہوا، اس کا اندازہ سامراج کے ابتدائی اور آخری دور کے لٹریچر سے کیا جاسکتا ہے، اس عہد میں ایسے اہل علم وفکر، تجزیہ نگار، صاحب فہم وفراست اہل قلم پیدا ہوئے جنہوں نے ذہن میں خود اعتمادی اور ایمان ویقین پیدا کیا، اس اعتبار سے یہ عہد تاریخ اسلام کے عہد اول کے علمی دور سے مطابقت رکھتا ہے، جس دور میں یونانی علوم وفنون عربی زبان میں منتقل ہوئے، مسلمانوں نے معاصر فلسفہ کا گہرائی سے مطالعہ کیا، اس کو مدون کیا اور تلخیص وتشریح کرتے وقت اپنی علمی لیاقت سے مفید اور غیر مفید مواد میں فرق واضح کیا اور اس علمی سرمایہ میں اپنی فکر وتحقیق سے اضافہ کر کے ان کو اسلامی ادب عطا کیا، ان اہل فکر کی حیثیت معاشرہ میں ایسے علمی سرچشمہ کے مانند ہوگئی جو تعلیم یافتہ طبقہ کے لیے مرجع کی حیثیت رکھتا ہے، ان لوگوں نے زمانہ کے مطابق اسلام کی علمی وعقلی تشریح کی اور علم وتحقیق کے ایک نئے دور کا آغاز کیا۔

موجودہ دور میں بعض لوگوں نے دعوت کو عام کرنے کے لیے صحافت، نشر واشاعت کے وسائل اور علمی مذاکروں کا بھی اہتمام کیا، مختلف مذاہب اور نظریات کے ماننے والوں خاص طور سے عیسائیت، ہندومت، بدھ مت کے پیروکاروں سے رابطہ قائم کرنے کے مختلف طریقے اختیار کیے۔ ۱۱ر ستمبر کے واقعات کے بعد جب دہشت گردی کا مسلمانوں پر الزام لگا کر اسلام کے خلاف دوبارہ نظریاتی اور سیاسی جنگ شروع کی گئی تو اس علمی قافلہ کے رہبروں نے اس غلط اور بے بنیاد الزام کے مقابلہ کے لیے کانفرنسوں، باہمی ملاقات ومذاکرات اور تحریر وتقریر کے ذریعہ اس الزام کی تردید اور اسلام کی امن پرستی، حب الوطنی، انسانیت دوستی کی وضاحت کی کوشش کی، اس کے لیے صحافت، انٹرنیٹ، ویڈیو، کتب ومنشورات، ڈائیلاگ اور کانفرنسوں کے ذرائع کا استعمال کیا گیا اور یہ سلسلہ جاری ہے، اس کے ساتھ مسلم سماج کی اصلاح کی بھی مہم چلائی گئی، کیونکہ مسلم سماج کا بگاڑ خود اسلام کے تصور کو داغدار کرتا ہے، چنانچہ ان لوگوں کی کاوشوں کے نتیجہ میں اسلام کا دائرہ وسیع ہوا یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگوں میں اسلام کے مطالعہ کا داعیہ پیدا ہوا جس کے نتیجہ میں ایک بڑی تعداد نے اسلام قبول کیا، اس کا اندازہ اسلامی تحریکوں، تعلیمی وتربیتی اداروں کے قیام اور میڈیا میں اسلامی وجود سے کیا جاسکتا ہے اور اسلام قبول کرنے والے تعلیم یافتہ عناصر سے جو مختلف مذاہب اور ملکوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

علمی وفکری میدان میں یہ پیش قدمی ایک خوش کن تبدیلی ہے اور علمی اور ثقافتی لحاظ سے اسلام کی واپسی کی علامت ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ مسلم سماج کی عمومی حالت کو بھی نظر انداز کرنا اس پیش قدمی کے راستہ میں رہزنی کا مترادف ہے، محض نظریاتی یا فکری اسلامیت اسلامی انقلاب لانے میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی جب کہ وہ زندگی میں رائج اور معروف نہ ہو اور مسلم سماج اسکا نمونہ نہ بنے، لٹریچر سے اسلام قبول کرنے والوں کو اکثر اس سلسلہ میں مایوسی کا شکار ہونا پڑتا ہے۔

عہد اول کی اسلامی تاریخ گواہ ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں جس طرح علم وفکر میں مسلمانوں نے پیش قدمی کی، اسی طرح مسلمانوں کی زندگی اسلامی تعلیمات کی تصویر تھی وہ زندگی کے تمام شعبوں میں اسلامی حقائق اور اس کی تعلیمات سے آراستہ تھے لوگوں نے ان کے سیرت وکردار، اخلاق واعمال کو دیکھ کر اسلام قبول کرلیا، انہوں نے علم سے زیادہ عمل کو ترقی دینے اور اس کے میدان کو وسیع کرنے میں اپنی کوششیں صرف کیں، علم کے ساتھ اگر عمل نہ ہو تو پھر کسی قوم کا ستارۂ اقبال بلند نہیں ہوسکتا، البتہ وہ اپنے علم کے ذریعہ لوگوں کے دلوں کو تھوڑی دیر کے لیے متاثر کردے اور بعض متکلمین کو خاموش کردے، لیکن وہ دلوں کو فتح نہیں کرسکتا۔

اسلام علم وعمل کا جامع ہے، ہمارے اسلاف کا یہی دستور رہا ہے کہ انہوں نے علم کے ساتھ عمل کا بھی اہتمام کیا ہے، بعض اہل علم کے بارے میں تاریخ میں اس کی مثالیں ملتی ہیں کہ جتنا علم حاصل کرتے اس پر عمل شروع کردیتے اور مزید علم اس وقت تک حاصل نہ کرتے جب تک حاصل شدہ علم پر عمل نہ شروع ہوجاتا، اسی طرح قول وفعل میں مطابقت کی مثالیں ملتی ہیں، وہ اس بات کی تلقین کرتے جس پر ان کا عمل ہوتا، وہ عالم باعمل تھے وہ اپنے عمل سے معروف تھے، صحابۂ کرام، تابعین اور ان کی راہ پر چلنے والے لوگوں کی حیات طیبہ دوسروں کے لیے عملی زندگی کا نمونہ ہوتی تھیں، اگر وہ علم کے ساتھ عمل نہ کرتے تو اس کا عمل دوسروں کے لیے قابل حجت نہ رہتا، علم کے بارے میں ان کا رویہ صدق وعمل کا تھا، اس کا اندازہ اس دور کے اہل علم کی زندگی سے کیا جاسکتا ہے، یہ خصوصیت صرف دینی علوم کی تحصیل میں مشغول علماء ہی کی زندگی میں نہیں پائی جاتی؛ بلکہ ادب اور فلسفہ کی تحصیل میں مشغول علماء کی زندگی میں بھی اس کے نمونے ملتے ہیں۔

اسلام تمام ادیان ومذاہب کے مقابلہ میں جس طرح عمل پر زور دیتا ہے اسی طرح علم پر زور دیتا ہے اور اس نے علماء عاملین کو اعلیٰ مرتبہ عطا کیا ہے، ہمارے اسلاف نے

علمی میدان میں ترقی کی اور مختصر مدت میں کتب خانے عام کیے اور اس میں دیانت وامانت کا ثبوت دیا، اس کی مثال دوسرے مذاہب میں ملنا مشکل ہے۔

عصر حاضر میں داعیوں نے اسلام کی نشر واشاعت کرنے، غیروں کو اس سے باخبر کرنے میں جو نمایاں کامیابی حاصل کی ان پر ہمیں فخر ہے؛ لیکن اس سے ہماری علمی ذمہ داریاں ختم نہیں ہوتیں، ہماری تمام تر کوششیں اسی وقت کامیاب ہوسکتی ہیں جب علم کے ساتھ عمل کا رنگ غالب ہو کیونکہ آج دنیا ہمارے علمی کارناموں کو دیکھنے سے کہیں زیادہ ہماری سیرتوں کو دیکھتی ہے، ہمارے اخلاق وکردار کو دیکھتی ہے، مثال کے طور پر اگر ہم اپنی تحریر وتقریر میں قرآن وحدیث کی تعلیمات کی روشنی میں اتحاد واتفاق پر زور دیتے ہیں اور "لافضل لعربی علی عجمی" اور مساوات کے احکام بیان کرتے ہیں، پڑوسیوں، گھر، خاندان، اساتذہ، طلبہ، حاکم ورعایا کے باہمی حقوق پر روشنی ڈالتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ خود ہمارے درمیان عدم مساوات یا تفاخر کا اظہار ہوتا ہے تو یہ اس دعوے کی طرح ہے جس کی دلیل نہ ہو، اسی طرح امانت، دیانت حرام وحلال کا لحاظ، صدق، رحم ومروت، انسانی حقوق کی حفاظت، ایثار وقربانی کے جذبات ہیں جن کا اظہار مسلم سماج میں دوسرے سماج سے زیادہ ہونا چاہئے، اکثر یورپی اور ہندو، اسلام کی دعوت دینے کے بعد ہی اسلام قبول کرتے ہیں، وہ مسلمانوں پر عائد ہونے والے فرائض وحقوق کو بغور سنتے ہیں، اس لیے جب وہ عملی میدان میں مسلمانوں کی اجتماعی زندگی، ان کے اخلاق وکردار، فکری جمود، اقتصادی استحصال، طبقہ واریت، مذہبی، فکری، قبائلی، اختلافات کو دیکھتے ہیں تو حیران وپریشان ہوجاتے ہیں۔

اسلامی لٹریچر کے مطالعہ کے ذریعہ اسلام لانے والوں کی اچھی خاصی تعداد نے اس کی شکایت کی ہے کہ جب ان لوگوں نے مسلم معاشرہ میں قدم رکھا تو انہوں نے مسلمانوں کی زندگی کو اسلامی تعلیمات کے بالکل برعکس پایا، بلکہ اسلام کی دعوت دینے والوں کی زندگی کو اس سے مختلف پایا تو ان پر بڑی مایوسی طاری ہوئی، یہی واقعہ ایک نومسلم خاتون کے ساتھ پیش آیا، وہ کہتی ہیں کہ جب اس نے ایک روایتی مسلم سے شادی کی تو اس

نے اس کے عقیدہ اور طرز معاشرت میں ہندوؤں اور غیر مسلموں کے عقائد کا رنگ پایا، نیز اس نے اس کو دینی، اخلاقی، معاملات میں تساہلی کا شکار پایا، اسلامی تعلیمات اور مسلمانوں کے مابین اس شدید اختلاف و دوری سے نومسلموں کو اکثر صدمہ ہوتا ہے اسی طرح دعوت کے ذمہ داران، اسلامی تحریکات کے قائدین، سرکاری دفاتر اور دیگر کمپنیوں میں کام کرنے والے افراد کی زندگیاں بھی اسلامی تعلیمات کی نمائندگی نہیں کرتیں، اس سے دعوت واصلاح اور علم وعمل میں تعارض ظاہر ہوتا ہے، یہ تعارض اسی وقت ختم ہوسکتا ہے جب علماء اور داعی، مسلم معاشرہ کی اصلاح کی طرف خصوصی توجہ دیں، قول وعمل میں مطابقت پیدا کریں اور مسلمانوں کے داخلی امراض کا اس طرح علاج کریں کہ ان کے اور غیروں میں کوئی فرق باقی نہ رہے، انہی امراض کی بنیاد پر دشمن اسلام پر حملہ کرنے اس کی صورت کو مسخ کرنے کی غلط اور باطل تدبیریں کررہا ہے۔

اس دور کا یہ المناک سانحہ ہے کہ مسلمان دوسرے لوگوں میں تو اسلامی تعلیمات اور اس کے اصول وحقائق کی دعوت دیتے ہیں؛ لیکن اپنی زندگی میں اسلامی احکام اور اسلامی تعلیمات سے اپنے دامن کو جھاڑ لیا ہے، آج ہم لوگوں کو ایسے امور کی دعوت دیتے ہیں جس کے ہم خود پابند نہیں ہیں، ہماری زندگی اسلامی تعلیمات سے دور ہے۔

اسلام کی نشر واشاعت کے لیے کی جانے والی کوششیں اسی وقت ثمر آور ہوسکتی ہیں جب داعی اسلام اپنی زندگی کو اسلامی تعلیمات کے مطابق گزاریں، ہمارے بعض داعی یہ سمجھتے ہیں کہ یہ تبدیلی حکومت کے بغیر نہیں ہوسکتی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے اکثر تعلیمات پر عمل کرنے کے لیے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں؛ بلکہ یہ رضا کارانہ عمل ہے، ہر مسلمان اس کو اپنی زندگی میں نافذ کرسکتا ہے، مثلاً صداقت وامانت، مساوات وصلہ رحمی، حقوق کی ادائیگی، شرعی ذمہ داریوں کی پابندی کے لیے حکومت کی کیا مجبوری ہے، ان تمام امور کو اختیار کرنے میں مسلمان خود مختار ہیں، تاریخ کے مطالعہ سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ پہلا

اسلامی معاشرہ انفرادی تقویٰ اور زہد سے وجود میں آیا جس کے نتیجہ میں اجتماعی نظام وجود میں آیا اور اس کے نتیجہ میں نظام حکومت وجود میں آیا، کیونکہ انفرادی اور شخصی تعمیر ہی اجتماعی نظام کی اساس ہے، انفرادی زندگی اگر درست ہوگی تو پورا معاشرہ درست ہوگا، اسلامی قانون خود بخود وجود میں آجائے گا، تاریخ اسلام اس طرح کی مثالوں سے پر ہے، اسی سلسلہ کا ایک واقعہ فاروق اعظمؓ کی خلافت میں پیش آیا جس سے رعایا اور حکام کی اعلیٰ درجہ کی احساس ذمہ داری پر روشنی پڑتی ہے۔

حضرت عمرؓ نے اپنی خلافت میں دودھ میں پانی ملانے سے منع کر دیا تھا، ایک رات شہر میں گشت کر رہے تھے، دیکھا کہ ایک عورت اپنی بیٹی سے کہہ رہی ہے کہ صبح ہونے کے قریب ہے تو نے ابھی تک دودھ میں پانی کیوں نہیں ملایا، لڑکی نے کہا، امیر المومنین نے اس سے منع کر دیا ہے، عورت نے کہا امیر المومنین کو معلوم بھی نہیں ہوگا، لڑکی نے کہا، امیر المومنین تو نہیں دیکھ رہے؛ لیکن امیر المومنین کا خدا تو دیکھ رہا ہے، میں ایسا ہرگز نہیں کر سکتی، ماں اور لڑکی کی اس گفتگو کو حضرت عمرؓ نے سن لیا، چنانچہ جب صبح ہوئی تو حضرت عمرؓ نے اپنے بیٹے عاصم کو بلایا اور اس لڑکی کی صفات بیان کیں اور کہا: بیٹے فلاں جگہ جاؤ، اس لڑکی کے متعلق پوچھ کر آؤ، عاصم گئے تو دیکھا وہ لڑکی قبیلہ حلال سے تعلق رکھتی ہے، عمر نے بیٹے سے کہا: جاؤ اس کو شادی کا پیغام دو، وہی اس کی مستحق ہے کہ عرب کے مشہور ترین شہسوار کے نکاح میں آئے، چنانچہ عاصم نے شادی کر لی جن کے بطن سے ام عاصم بنت عاصم ابن عمر پیدا ہوئیں جو عبدالعزیز بن مروان سے منسوب ہوئیں، پھر ان کے بطن سے عمر بن عبدالعزیز پیدا ہوئے۔

آج جب کہ ہر طرف قتل وغارتگری، ظلم وعیاری، مکر وفریب، عداوت وبغاوت، خدا کی نافرمانی کا بازار گرم اور ان کے اخلاقی جرائم کو بطور فن کے پیش کیا جا رہا ہے جس کے نتیجہ میں انسانی زندگی امن وسکون سے محروم ہوگئی ہے، بداعتمادی عام ہے، انسان کی جان

ومال محفوظ نہیں، اگر مسلمان عزت وشرافت کی، عفت وپاکدامنی کی، ایثار وقربانی کی، امانت ودیانت کی زندگی گزاریں تو مسلمان دوسروں کے لیے نمونہ ہوں تو ان کی زندگی اسلام کی براہ راست دعوت بن جائے، اسی کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَتَّقُوا اللَّهَ يَجْعَل لَّكُمْ فُرْقَانًا وَيُكَفِّرْ عَنكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ﴾

(انفال:۲۹)

اے ایمان والو! اگر تم اللہ سے ڈرتے رہو گے تو وہ تمہیں فیصلے کی چیز دیگا، تم سے تمہارے گناہوں کو معاف کردے گا، اور انہیں بخش دے گا اور اللہ بڑا فضل والا ہے۔